قومی زبان

کراچی

انجمن ترقی اردو

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

قومی زبان

جلد ۳۲ — شمارہ ۲

فروری سنہ ۱۹۶۸ء

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فی پرچہ ایک روپیہ — قیمت: سالانہ دس روپے

فہرست

نذر سجاد حیدر	بیگم ہرمزی جلیل قدوائی	۳
سجاد حیدر مرحوم	نذر سجاد حیدر	۱۰
داسوخت راحت	گوہر نوشاہی	۲۳
نیاز احمد ہوش	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب	۳۹
سرسید احمد خاں مولانا آزاد کی نظر میں	ابو سلمان شاہجہانپوری	۴۵
لسانیات کی تاریخ پر ایک نظر	نیّر اقبال	۵۵
لکھنؤ کا تاریخی و سماجی ماحول	ڈاکٹر سید سلیمان حسین	۶۱
گرد و پیش		۷۷

ادارہ تحریر

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

بیگم ہرمزی جلیل قدوائی

نذر سجّاد حیدر

ممتاز ادیبہ نذر سجاد حیدر کے انتقال سے اردو کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، وہ اردو کی معمر ترین ادیبہ تھیں اور خواتین میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ مرحومہ کی یاد میں اس شمارے میں خصوصی مضامین شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس کے لئے ہم محترمہ ہرمزی جلیل قدوائی کے ممنون ہیں۔ موصوفہ نے نہ صرف یہ کہ خود ایک مضمون لکھا ہے بلکہ نذر سجاد کا ایک غیر مطبوعہ مضمون اور متعدد خطوط بھی عنایت کئے ہیں۔ بیگم قدوائی کے مرحومہ نذر سجاد سے خصوصی تعلقات تھے اور اسی بناء پر ان سے یہ مضمون لکھوایا گیا ہے۔ نذر سجاد کے خطوط آئندہ شمارے میں شامل کئے جائیں گے۔ (ادارہ)

محترمہ بیگم نذر سجاد حیدر کے انتقال کی خبر ہم سب کے لئے انتہائی افسوسناک اور دلشکن ہے۔ اسلئے نہیں کہ مرحومہ ہم سے جدا ہو گئیں، انہوں نے طولانی عمر پائی، موت تو آنی ہی تھی اور نظام قدرت کے تحت ایک اٹل واقعہ تھا جو پیش آیا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْت ٥ اس آیت کے پڑھنے کے بعد زندگی کی حقیقت سامنے آجاتی ہے اور سوائے صبر کے کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

افسوس اس بات کا ہے کہ اردو کی ایک ایسی مشاق اور پختہ کار مصنف اور افسانہ نگار کا انتقال ہو گیا جس کا نعم البدل ملنا مشکل ہے اور جو ہر حالت میں یعنی بیماری میں بھی اور مرتے دم تک اردو ادب کی خدمت کرتی رہیں۔ ان کی دماغی قوت لازوال تھی۔ اگرچہ عرصہ سے ان کی جسمانی قوت برائے نام رہ گئی تھی مگر اس زمانے میں بھی انہوں نے لکھا اور اس طرح کہ کسی بھی آئے گئے کو پکڑ لیا، خیالات اکٹھا کئے، لیٹے لیٹے بولتی گئیں اور آنے والا مہمان لکھتا گیا۔

ذاتی طور پر مجھے ایک محترم اور شفیق شخصیت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو جانے کا حد درجہ افسوس ہے، ان کی ذات میں بعض ایسی خصوصیات تھیں جو ہر خاتون میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی یاد مجھے عرصے تک ستائے گی

مرحومہ سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۴۸ء میں ہوئی جو اپنی قسم کی عجیب تھی۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ اسی سال پاکستان آئی تھی۔ اس وقت تک جلیل صاحب کو دہلی میں پاکستان ہائی کمشنر کے پریس اٹیچی کے فرائض انجام دینے پڑ رہے تھے۔ کراچی پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ سرکاری مکان فی الحال نہیں مل سکتا۔ چنانچہ ہوٹلوں میں قیام کا سلسلہ شروع ہوا، ایک ہوٹل سے دوسرے میں اور

دوسرے سے تیسرے میں۔ گرانڈ ہوٹل دوسرا ہوٹل تھا جس میں ہم نے شالیمار ہوٹل کے بعد رہنا پسند کیا، پھر اسے بھی بدل دیا۔

گرانڈ ہوٹل سے ملی ہوئی ایک بلڈنگ کی پہلی منزل کے دو کمروں کے ایک فلیٹ میں مرحومہ اپنے بیٹے، بہو، اور بیٹی کے مقیم تھیں۔ جلیل صاحب کو معلوم نہ تھا کہ وہ اسی بلڈنگ میں تھیں۔ بھائی سید حمید علی صاحب مرحوم لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ ان کی پھوپھی نذر نچلی منزل میں ہیں، انھیں بھی ان کو دیکھنا ہے، کہنے لگے "آپ لوگ بھی چلئے"۔ جلیل صاحب کی تو وہ ماں کی جگہ تھیں میرے لئے البتہ صرف ایک مصنفہ کی حیثیت رکھتی تھیں، مصنفہ بھی "ماں بیٹی" جیسے مسلسل افسانے کی جو مجھے اور میری بہنوں کو بے حد پسند تھا، چنانچہ جس طرح اس افسانے کو پڑھنے کے لئے "عصمت" کی جس میں وہ چھپ رہا تھا مشتاق رہتی تھی اسی طرح اس کی مصنفہ کو دیکھنے کی بھی آرزو مند تھی۔

ہم لوگوں کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں، مگر مجھ سے تو وہ گویا باقاعدہ انٹرویو لینے پر تل گئیں۔ "کیا نام ہے آپ کا؟" جب تک میں اپنا نام بتاؤں وہ دوسرا سوال کر بیٹھیں "کس کی بیٹی ہو؟" ابھی پہلا جواب نہ دے پائی تھی دوسرے سوال کا جواب کیسے دیتی۔ اتنے میں تیسرا سوال کر ڈالا۔ اب تو میں نے اپنے کو سنبھالا، جسم کو جنبش دی اور دماغ کو حاضر کر کے سلسلہ وار ان کی بھرتی سے جواب دینے کے لئے آمادہ ہو گئی، مگر صاحب کہاں میں سست رفتار اور کہاں وہ برق رفتار، میرا ان کا کیا مقابلہ؟ میں نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا اور ان کے دوسرے سوال کا جواب "جی میرے وا..." کہنے نہ پائی تھی کہ ایک اور سوال، اس کے بعد ایک اور پھر ایک اور...... میرا جی گھبرانے سا لگا۔ مجھے چکر سے آنے لگے۔ میرے خاوند یعنی اور سید صاحب سے باتیں کرنے اور چائے پینے میں مصروف تھے اور میں نہ چائے ہی پی رہی تھی نہ باتوں کے مزے لے رہی تھی بلکہ وہاں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سوچ رہی تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر جلیل صاحب نے میری طرف رخ کیا اور بچوں کی طرح بہلانے کی غرض سے مجھ سے کچھ کھانے کو کہا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کہا "بس اب چلئے بھی، بچے آپا کو پریشان کر رہے ہوں گے بہت دیر ہو گئی ہے"۔ شاید انھوں نے میرے تیور پہچان لئے اور فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اچھا اب اجازت دیجئے، دوبارہ حاضر ہوں گا،" یہ کہہ کر وہاں سے میرے ساتھ واپس آ گئے۔

اس واقعہ سے پہلے مجھے کبھی اتنے شدید قسم کے انٹرویو دینے کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میں بالکل ایک ناکام امیدوار کی طرح بوجھل قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور بستر پر اوندھے منہ گر گئی۔ جلیل صاحب تاڑ گئے کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ میری خاموشی اور نڈھال پن کی وجہ پوچھنے لگے۔ پھر کیا تھا، ان پر بری طرح برس پڑی "جب آپ کو معلوم تھا کہ وہ اس قدر تیزی سے مجھ سے میرا احوال دریافت کریں گے تو مجھ بے وقوف کو وہاں لے کر کیوں گئے"۔ وہ اتنی پڑھی لکھی، دنیادار، جہاں دیدہ، پختہ کار اور میں، ان کے سامنے کل کی چھوکری جسے بات کرنے کا ڈھنگ نہ آتا ہو جواب دینا اور اس اعتماد اور تیز کلامی سے دینا تو بڑی بات

ہے۔ انہوں نے میرے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی، سوائے اس کے کہ میں پرلے درجہ کی گاؤدی اور بے وقوف ہوں۔ ان کے ایک سوال کا جواب بھی فوراً نہ دے سکی۔"

میرے میاں نے مجھے بتایا "بھئی ان کی گفتگو کا انداز ہی یہی ہے۔ تمہیں ذلیل کرنا تھوڑا ہی مقصود تھا، خیر میں انہیں سمجھا دوں گا۔ بس تم اٹھو، منہ ہاتھ دھوؤ اور پھر چلو ٹہلنے"۔

دوسرے دن پھر وہی گھڑی آئی، نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن۔ میاں کی خاطر دوبارہ جانا پڑا۔ لیکن اس دفعہ میں انہیں سلام کر کے ان سے دور ہی بیٹھی اور عینی سے باتیں کرنی چاہیں۔ اتنے عرصہ میں جلیل صاحب اور مرحومہ میں کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ شاید اسی کے نتیجے میں اب کے مجھ سے انہوں نے بڑے نرم لہجے میں مخاطب کیا اور اپنے پاس پلنگ پر بٹھایا۔ "دلہن آرام سے بیٹھو۔ ارے عینی بیرے کو بلواؤ۔ جتنی دیر میں عینی بیرے کو بلاتیں انہوں نے خود ہی اپنی پاٹ دار آواز میں بیرے کو پکارا۔ "بیرا۔ بیرا۔" بیرا آیا تو کچھ سموسے، نمک پارے اور بسکٹ وغیرہ جو وہ ہر وقت اپنے سرہانے کی ڈولی (گنجینہ) میں مہمانوں کو کھلانے کی غرض سے رکھا کرتی تھیں نکال نکال کر پلیٹوں میں رکھوا دیں، پھر خود چائے پیالیوں میں ڈالی پہلے مجھ کو دی، بعد میں جلیل صاحب کو۔ اس بار مجھ سے بہت سنبھل سنبھل کر باتیں کیں۔ پھر بھی میں نے غور کیا حسب عادت کہیں نہ کہیں تیزی سے موضوع بدل ہی جاتا تھا۔

اس ملاقات کے بعد سے پھر میں ان سے نہ گھبرائی اور نہ ان کو بچیائی بلکہ ان کی تیز تیز مگر میٹھی میٹھی اور لچھے دار باتوں کی کچھ چاٹ سی پڑ گئی۔ اور جب تک ہم گرانڈ ہوٹل میں رہے، روز یا ہر دوسرے تیسرے دن میں اور جلیل صاحب ان سے مل آتے۔ موضوع گفتگو زیادہ تر اپنے نامور شوہر کا ہوتا جسے میں بھی دلچسپی سے سنتی تھی کیونکہ اب تک میں ایسے ناموں سے صرف کتابوں کے ذریعہ یا غائبانہ طور پر آشنا تھی۔

بعد میں تو یہ ہو گیا کہ جہاں جہاں ہم ہوٹل اور ہوٹل کے بعد مکان بدلتے رہے مرحومہ ہماری درخواست پر برابر دو دو تین تین دن ہمارے گھر آ کر رہ جاتیں۔ میں بڑے شوق سے ان کے لئے علیحدہ کمرے کا انتظام کر دیتی۔ میرے ہر انتظام سے وہ بے حد مطمئن ہوتیں لیکن وضو کا لوٹا اور آبدست کا لوٹا اپنی آنکھوں کے سامنے میرے نوکر سے منجھواتیں۔ پاک کراتیں۔ مجھے ہنس کر دیکھتی جاتیں اور کہتی جاتیں۔ "تمہارے خیال میں یہ صاف ہے مگر میرے خیال میں چھینٹ ضرور پڑی ہوگی۔" اس پر میں بھی ان کے خیال کو رد نہ کرتی۔

کراچی میں مکانات کی سخت قلت تھی، ہماری طرح مرحومہ کو بھی گرانڈ ہوٹل والی بلڈنگ چھوڑ کر مختلف ہوٹلوں اور مکانوں میں منتقل ہوتے رہنا پڑا، کبھی ہمیں ان کے نئے پتے کی اطلاع ہو جاتی، کبھی نہ ہوتی۔ اس صورت میں ہم دونوں عرصے تک ان سے بے خبر رہتے۔ یکایک بذریعہ ڈاک ان کے پتے کی اطلاع ملتی اور خط میں ہمارے نہ ملنے جلنے کا گلہ شکوہ بھی ہوتا۔ اب ہم دونوں ان سے ملنے جاتے۔ اس وقت ہماری حالت چوروں کی سی ہوتی کہ اتنے دنوں بعد پہنچیں گے تو

ضرور ڈانٹیں گی، میرے میاں مجھ سے کہتے "تم کچھ بہانہ کر دینا"۔ میں کہتی "نہیں بھئی، مجھ سے تو وہ فوراً کہہ دیں گی، 'بہو ہو' اس لئے میاں کو بھی ملنے سے روکتی ہو، خود بھی کتراتی ہو، آپ ہی جو اصل بات ہے نہ معلوم ہونے کی شبہ، وہی کہہ دیجئے گا۔

کمرے میں داخل ہونے پر معلوم ہوتا کہ بہت بیمار ہیں، بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا، اٹھنا بیٹھنا، بات چیت کرنا تک ڈاکٹروں نے منع کر دیا ہے۔ عینی سے آہستہ آہستہ ہم لوگ ان کا احوال پوچھتے ہوتے، اتنے میں آنکھ کھول کر دیکھتیں اور پوچھتیں "عینی کون آیا ہے۔ کیا جلیل ہیں، ارے انہیں بٹھاؤ، ان سے کہو، اب کبھی کیوں آگئے۔ مر جاتی تب آتے"۔

جلیل صاحب اور میں شرمندگی ظاہر کرنا چاہتے مگر وہ موقع ہی نہ دیتیں اور جلیل صاحب سے مخاطب ہوتیں تو یوں "کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں عاق کر کے مروں؟" اتنی سخت بات کہہ کر فوراً بات کا موضوع بدل دیتیں۔ مجھ سے پوچھتیں "بچوں کو کس پر چھوڑ کر آئی ہو؟ نوکر ہے جو آیا ہے؟ بیٹھو۔ یہ جاڑوں کی رات اور تم اس طرح لفافہ بنی ہوئی ہو۔ سردی نہیں لگتی؟ ہاں ابھی کم سن ہو۔ فیشن زیادہ پیارا ہے، صحت کا خیال کرو۔ کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ یہ دیکھو میری طرف، سر، منہ، سینہ سب گرم کپڑوں سے لپیٹے پڑی ہوں پھر بھی سردی لگ گئی۔ اب کچھ بہتر ہوں۔" باتیں کرتے کرتے برقی گھنٹی جو ان کے بستر ہی میں لگی ہوتی دباتیں، نوکر آتا، اس سے بجلی کے چولہے پر چائے بنانے کو کہتیں اور حسب معمول سرہانے کی ڈولی میں سے کچھ کھانے کی چیزیں نکلواتیں اور اس طرح مریض جبکی ہم مزاج پرسی کرنے جاتے الٹی ہماری مزاج پرسی کرتا۔ وہ چائے پلواتیں، بچوں کی، میرے بہن بھائیوں کی اور نوکروں تک کی خیریت پوچھتی تھیں۔

ہم لوگ جیکب لائن کے سرکاری مکان میں آچکے تھے، ایک دن اچانک معلوم ہوا، تشریف لائی ہیں اور ساتھ میں ایک اور خاتون ہیں جنھیں میں نے نہیں پہچانا مگر وہ مجھے جانتی تھیں۔ میں نے دونوں کو ادب سے سلام کر کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور دوسری خاتون کی تعریف پوچھی تو ہنس کر کہنے لگیں: "یہ امۃ الوحی ہیں، تمہارا بھائی اور ان کا لڑکا سعید دہلی میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے"۔ میں نے پھر بھی اجنبیت ظاہر کی تو امۃ الوحی صاحبہ نے میرے مرحوم بھائی ادریس عرف دولھا کا نام لیا تو میں نے پہچانا۔ آیا چائے وغیرہ لے کر آئی۔ اتنے میں جلیل صاحب دفتر سے واپس آگئے اور میں نے انہیں مرحومہ کی آمد کی خبر دی، وہ جوش کے مارے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ مرحومہ نے زور سے کہا "اندر مت آ، پردہ ہے"۔ وہ سمجھے مذاق کر رہی ہیں، وہ پھر بھی چلے ہی آئے۔ تب تو وہ اپنی عزیز دوست کی طرف اپنی ساڑھی کے آنچل کی آڑ لے کر کھڑی ہو گئیں اور آنکھیں دکھا کر جلیل صاحب کو ڈانٹنے لگیں "کہہ رہی ہوں پردہ ہے، پھر بھی گھسے چلے آ رہے ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ چلو اپنے کمرے میں، میں وہیں آ رہی ہوں"۔ جلیل صاحب الٹے پاؤں وہاں سے واپس آگئے اور پھر کمرے سے نکلے ہی نہیں۔

میں ان دونوں محترمات کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی کہ میری بڑی بچی جو اس وقت صرف چھ سات برس کی تھی اور گھٹنوں سے اونچی فراک پہنے ہوئے تھی کھیلتی کھیلتی میرے پاس آن کھڑی ہوئی۔ خالہ وحی نے جو بہت مذہبی خاتون ہیں فوراً اس کی ننگی ٹانگوں پر اعتراض کیا۔ جتنی دیر میں انہیں ان کے اعتراض کا معقول جواب دیتی، تیزی سے مجھے بولنے سے روک کر کہنے لگیں: "تم ٹھہرو۔ میں

اس دلہن کو بتاتی ہوں کہ یہ کون سے قرآن میں لکھا ہے کہ بچوں کا لباس ایسا ہو اور ایسا نہ ہو"۔ خالہ جی فوراً مسکرا دیں اور کہنے لگیں۔ "آپ تو جا اور بے جا مجھ ہی سے الجھ پڑتی ہیں۔ اب میں چھوٹوں کے سامنے کیا بحث کروں۔ آپ سے (میری طرف اشارہ کرکے) کہتی ہیں، یہ میرے سامنے کی بچہ ہیں اور (میری بچی کی طرف اشارہ کرکے) اور وہ تو بالکل ہی معصوم ہے۔ چھوڑیے ان قصوں کو۔ یہ تھی دونوں بزرگوں کی پیار بھری جھڑپ۔

میں نے دونوں کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ ہم جیسے برخورداروں پر ہی نہیں بلکہ اپنے برابر والوں پر بھی حاوی رہتی تھیں۔ بعد میں مجھے یاد آگیا کہ محترمہ امتہ الوحی میری والدہ کی بھی دوست تھیں اور میں نے خالہ جی کے اعتراض کا برا نہیں مانا ٹوکنا، ڈانٹنا، پیار کرنا یہ مشفق بزرگوں کی شان میں داخل ہے۔

چائے پی کر جلیل صاحب کے کمرے میں تشریف لے گئیں اور طرح طرح کی باتیں کرتی رہیں۔ میں خالہ جی سے اپنے مرحوم بھائی کے تذکرے سنتی رہی اور مجھے خالہ جی سے بھی ایک خاص قسم کی انسیت ہوگئی۔ وہ بھی مجھ سے گاہے گاہے ملنے آجاتی ہیں۔

ایک بار ڈاک سے اطلاع ملی کہ سول ہسپتال میں پڑی ہیں۔ کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ بے گوشت کی تو وہ پہلے ہی تھیں۔ اس پر یہ غضب۔ اسی شام ہم دونوں ہسپتال پہنچے، اوپر کی نئی منزل کے ایک اسپیشل وارڈ میں بہت ساری چرخیوں اور رسیوں سے سنبھلی ہوئی پلاسٹر کی ہوئی ٹانگ لئے بستر میں پڑی تھیں۔ درد شدت کا تھا، کراہ رہی تھیں۔ عینی ان کے سرہانے ایک آرام کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔

اتنے عرصہ کی بار بار ملاقات کی وجہ سے میں بھی ان کی عادت سے بخوبی واقف ہوگئی تھی۔ اس لئے ان کی محبت بھری ڈانٹ سے بچنے کی غرض سے ان کے لئے گاجر کا حلوہ جو میں نے گھر میں بنایا تھا لیتی گئی تھی کیونکہ جب وہ ہمارے یہاں آکر ٹھہری تھیں، اکثر میں نے انہیں ناشتہ پر سوئیوں کا شیر خورمہ اور شام کی چائے پر گاجر کا حلوہ دیا تھا۔ اور دونوں چیزیں وہ بڑی رغبت سے کھاتی تھیں۔ کھاتی جاتیں اور مزے لے کر بنانے کی ترکیب پوچھتی جاتیں، ساتھ ہی بلڈ پریشر بڑھنے کے ڈر سے یہ بھی کہتی جاتیں۔ "یہ سب چیزیں معدے کے لئے ثقیل ہوتی ہیں' لیکن تم نے محبت سے بنایا ہے، مزے دار بھی ہے، کوئی ہاضمے کی دوا پھر دینا' کھا لیتی ہوں"۔

اسی درد کی حالت میں سلام کے جواب میں سوال کیا: "کمرہ ڈھونڈنے میں دقت تو نہیں ہوئی؟" پھر ہاتھ میں کھانے کا ڈبہ دیکھ کر کہنے لگیں: "یہ کیا ہے؟" میں نے کہا گاجر کا حلوا آپ کے لئے چلتے چلتے بنالیا تھا، جب جی چاہے کھا لیجئے گا۔ منع تو شاید نہ ہوگا۔ عینی سے ڈبہ لے لینے کو کہا اور ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا، کراہتی بھی جاتی تھیں مگر ہڈی ٹوٹنے کی پوری داستان دہرائی۔

"کرنل شاہ یہاں لاکر ڈال گئے ہیں۔ بلڈ پریشر دکھانے کے لئے ان کے کلینک گئی تھی۔ ان کی میز پر سے اترتے میں چکنے فرش کی وجہ سے جو پاؤں پھسلا تو بس زمین پر ڈھیر ہوگئی۔ کرنل اسی طرح ہاتھوں میں اٹھا کر موٹر میں ڈال کر سیدھے آپریشن روم میں لائے۔ خدا معلوم پھر کیا ہوا، آنکھ کھلی تو خود کو اس کمرے میں رسیوں اور چرخیوں سے جکڑا ہوا پایا"۔

پھر خود ہی ہنسیں اور کہنے لگیں: "وہی کرنل شاہ جو تمہیں گرانڈ ہوٹل سے 'فرشتۂ حیات' بن کر موٹر میں ڈال کر رات کو
دو بجے جناح ہسپتال لے گئے تھے جب تم کو کسی موذی ڈاکٹر نے بلاوجہ دل کا مریض مشہور کر دیا تھا اور جواب دے دیا تھا، یہ میرے
لئے موت کا فرشتہ بننے والے تھے، ابھی نہ جانے زندگی کتنی اور باقی ہے جو ٹانگ پر ہی خیر گزری، ورنہ میں برسوں کی دل کی مریض دھڑکے
سے دل ہل جاتا اور ختم ہو جاتی۔"

ہم دونوں نے ان کے لئے دعائیہ الفاظ دہرائے اور زندہ دلی کے ساتھ ان سے باتیں کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ
درد کو بھولی رہیں۔

کچھ عرصے بعد ہڈی جڑ گئی، اپنے گھر واپس آ گئیں، پھر مہمان بطور روگ انہیں اپنے گھر لے جانے لگے، کچھ دن بعد معلوم ہوا پھر گر گئی
تھیں اور پھر ہڈی ٹوٹ گئی تھی، غرض یہ کہ نہ جانے کتنی تکلیفیں اٹھائیں دھان پان سی میری اس پیاری ضعیفہ نے۔ آخری عمر میں یہاں
سے جا کر بمبئی میں بھی ہڈی ٹوٹی۔ آخر موت نے ان کی مشکل آسان کی لیکن میں ان کے صبر و استقلال اور قوت برداشت کی داد دیتی ہوں۔
میں ایسے معاملوں میں بڑی بودی ہوں۔ نہ خود چین سے سوتی ہوں، نہ ڈاکٹر اور تیمار دار کو چین سے بیٹھنے دیتی ہوں۔

آخری بار ہم لوگ ان سے گارڈن روڈ کوارٹرز میں جا کر ملے۔ عینی انڈیا جا چکی تھیں۔ چھبو جی (ان کے صاحبزادے مصطفیٰ
حیدر) کی دلہن اور بچے آئے ہوئے تھے۔ ہم نے ان کا حال پوچھنے کے بعد عینی کی خیریت پوچھی تو کچھ خاموش سی ہو گئیں، جس سے ہم نے
اندازہ لگایا کہ آخر ماں ہیں۔ عینی کی یاد ستا رہی ہو گی۔ پھر ہم نے عینی کے بارے میں بات نہیں کی، دوسری باتیں کرنے لگے۔ پھر
وہ حسب عادت کچھ کھلانے کو دینے لگیں۔ میں نے کھانے سے انکار کیا تو زور سے ڈانٹا: "آخر تم اتنی شہزادی کیوں واقع ہوئی ہو؟"
اس پر میں نے انہیں خوش کرنے کو تھوڑا سا کھا ہی لیا۔

میرے لباس کی، چوڑیوں کی ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی تعریف کی۔ کوئی مشاعرہ ہونے والا تھا، جلیل صاحب سے پوچھا "جاؤ گے
مشاعرے میں اور اس بچی کو بھی لے جاؤ گے؟" مجھے بچی اس لئے کہتی تھیں کہ اور ایک بار میں ان کے اصرار پر مشاعرے میں گئی تھی،
میری کمزوری ہے کہ رات کو کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد ہی نیند آ جاتی ہے، چنانچہ مشاعرہ میں بھی وہی ہوا، جمائیاں آئیں اور میں نے
آنکھیں رگڑنا شروع کیں۔ پھر میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اس کے بعد صوفے پر سر ٹکا کر سو گئی۔ ذرا دیر بعد میں نے دیکھا، مجھے جگا
رہی تھیں: "اے دلہن! تم سو گئیں۔ ملے ہے بالکل بچی ہو۔ سنو سنو۔ دیکھو، وہ چھیلا بخاری، اپنی وہی غزل سنا رہے ہیں، ڈھلتے
ڈھلتے، چلتے چلتے، وہ دیکھو، اسے دیکھو تو کرتہ پائجامہ اور اس پر سنہری واسکٹ بھی پہن رکھی ہے۔" میں نے بھی بخاری صاحب کو
آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، مجھے بھی وہ اچھے لگے، ویسے ہی جیسے مرحومہ کو لگتے تھے۔

ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ مرحومہ سے آخری ملاقات ہو گی، ان کی موت کی خبر ڈان میں پڑھ کر شکستہ ہو گئی گرانڈ ہوٹل کی پہلی ملاقات
سے لے کر گارڈن روڈ کوارٹرز کی آخری ملاقات تک کی مدت کے تمام واقعات آنکھوں کے سامنے اس طرح آنے لگے جیسے ہم ان میں
گھوم رہے ہوں اور کل کی بات ہو۔ اور دل پر جس طرح غم نے ہجوم کیا ہے اللہ ہی جانتا ہے۔

دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اگر آج وہ جسمانی طور پر ہمارے ساتھ نہیں ہیں لیکن ادب کی دنیا میں وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ انہوں نے جس طرح اردو ادب کی خدمت کی ہے کوئی نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ بیماری کے بستر سے بھی مضمون لکھوا کر بھجواتی رہیں۔ جلیل صاحب کے اصرار پر انہوں نے اپنے نامور شوہر سجاد حیدر یلدرم مرحوم کے ساتھ اپنی زندگی کی ایک طولانی داستان بھی کچھ خود لکھی، کچھ لکھوائی۔ افسوس پھر بھی نامکمل رہی۔[1]

اللہ سے دعا ہے کہ عزیزہ بیٹی کو جو تنہا رہ گئی، ان کا صبر جمیل عطا فرمائے اور حوصلہ و ہمت دے کہ وہ اپنے قابل ترین والدین مغفور کی یادوں کو اپنی ادبی خدمت سے تازہ کرتی رہیں۔ مرحومہ کے عزیز از جان بیٹے مصطفےٰ حیدر (جیبو جی) اور ان کے متعلقین کو بھی خداوند کریم صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔

---

[1] مرحومہ کی یہ تحریر اس اشاعت میں شامل ہے۔

گلشن ہمیشہ بہار

نصر اللہ خاں خویشگی نے یہ تذکرہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ "گلشن بے خار" کے جواب میں لکھا تھا۔ ۱۸۳۵ء میں یہ پہلی بار شائع ہوا تھا۔ پہلی اشاعت کے بہت کم نسخے اب دستیاب ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی (استاد شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی) نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس میں ۱۹۷ شاعروں کے حالات ہیں۔ مرتب نے جا بجا حواشی لکھ کر اس کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ آفسٹ کی طباعت۔

صفحات ۳۴۴ قیمت آٹھ روپے

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ

کراچی ۱

سجاد حیدر مرحوم

(غیر مطبوعہ مضمون)

آئینہ دل میں شکل تیری ہے طرفہ جواب لاجوابی
(حسرت موہانی)

غالباً جنوری ۱۹۰۸ء کا زمانہ تھا۔ میرا بچپن ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا۔ ویسے سمجھدار سیانی تھی۔ اردو اخبار اور رسالے تو آٹھ سال کی عمر سے پڑھنے لگی تھی، خصوصاً رسالہ مخزن سے دلی اُنس تھا۔ میرا پہلا مضمون بھی اسی میں چھپا تھا۔ اخبارات میں سب سے زیادہ علی گڑھ گزٹ اور وکیل امرتسر کی قدردان تھی۔ وکیل نہایت ہمدردِ قوم اور اصلاحی اخبار تھا۔ معاشرتی اصلاح میں پہلا قدم اسی کے ذریعہ اٹھایا گیا تھا۔ میں نے بھی اپنی کہنہ، فضول رسومات شادی وغم کے خلاف وکیل ہی میں لکھنا شروع کیا تھا، اس کے بعد تہذیب نسواں میں۔ مگر وہ زمانہ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء کا تھا۔ جب میرا شمار کمسن لڑکیوں میں تھا۔

ہاں تو ۲۵ رجنوری، ۱۹۰۸ء کی ابتدا تھی۔ مخزن کے لئے ڈاک کا انتظار تھا۔ جنوری کا پرچہ مخزن جو ملا تو اس میں ایک بہت ہی اچھا دلچسپ مضمون دیکھا۔ ہیڈنگ تو یاد نہیں۔ مگر وہ لکھا ہوا یلدرم کا تھا۔ میں نے پڑھا۔ اور تعریف کے ساتھ اپنے پاپا اور اماں جان کو دکھایا۔ اس دن سے تو اور بھی ہر رسالہ کا شدت و بے صبری سے انتظار ہونے لگا۔ ان دنوں یلدرم بغداد میں تھے۔ اور وہاں سے بہت ہی دلچسپ کچھ معاشرتی اور جذباتی مضامین لکھا کرتے تھے۔ نوجوان تھے اردو میں قابلیت رکھتے تھے۔ ترکی بھی جانتے تھے۔ اس وجہ سے اُن کے افسانے نہایت دلچسپ و دلکش ہوا کرتے تھے۔ زیادہ تر ترکی سے ترجمے ہوا کرتے تھے۔

اُس وقت تک اُن کے صرف تین ترکی ناولوں کے ترجمے جو بزمانۂ طالب علمی علی گڑھ کالج میں کئے تھے شائع ہوئے تھے۔ بعد کو عراق گئے۔ تینوں چھوٹے چھوٹے قصوں کے نام تھے۔ زہرا۔ ثالث، بالخیر، مطلوب حسینان۔ پھر چار سالہ قیام بغداد میں تو یلدرم نے ایسے ایسے افسانے لکھے کہ ان کا شمار اردو کے ادیبوں میں ہو گیا۔ غالباً ۱۹۱۱ء میں وہ مجموعہ جس کا نام "خیالستان" ہے شائع ہو گیا تھا۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، نو عمری، بے فکری، عراق کا قیام، بار بار

ترکی و ایران کا سفر، جذباتی ادبیت کا ایک چشمہ تھا کہ اُبل رہا تھا۔ میں کیا سبھی پڑھنے والے بے تابی سے بغدادی نوعمر افسانہ نویس کی تحریر کے منتظر رہتے تھے۔ یلدرم نے اس وقت اردو میں بالکل نئی طرز انشا کی بنیاد رکھی۔ جس کی لوگوں نے برسوں نقل کی۔

آخر وہ وقت ختم ہوا اور یلدرم با دلِ ناخواستہ ہندوستان واپس آئے۔ ان کو ترکی سے عشق تھا اور اجداد پر اس وقت ترکی کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ گو تعلیم نسواں کا ابھی عراق میں زیادہ چرچا نہ تھا۔ مگر قسطنطنیہ میں قابل خواتین اور لڑکیاں پڑھائی جاری تھیں۔ یلدرم کو تعلیم اور آزادیٔ نسواں کا سودا تھا۔ یہی سبب تھا کہ ترکی کے نام پر مرتے تھے۔

غرض وہاں دونوں خوب چلے اور دل آویز افسانے بغداد سے "مخزن" میں بھیج رہے تھے جسے ہمارا گھر بھر نہایت شوق سے پڑھتا تھا۔ اور دوسرے لوگ "مخزن" پسند کرتے جاتے تھے۔ اتفاق ہے کہ ان ہی دنوں میں نے بھی نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ مسلمان لڑکیاں اس زمانے میں بہت ہی کم لکھا کرتی تھیں۔ اس وجہ سے میرے مضامین پر بہت سی نظریں پڑا کرتی تھیں۔ دو تین سال گذر گئے اور یلدرم عراق سے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ ہو کر ہندوستان واپس آ گئے۔ اور دو برس وہیں معزول امیر کابل کے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ وطن واپس آ جانے پر عزیزوں اور دوستوں نے انہیں جلد شادی کرنے کے لئے دباؤ دیا۔ پہلے تو وہ یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ "میں بغداد میں ایک ترک لڑکی سے شادی کر آیا ہوں اور میری ایک لڑکی بھی ہے" مگر اس بات کا کسی کو یقین نہیں آیا۔ اور سب نے شادی کر لینے پر مجبور کیا۔

اب یہ فکر ہوئی کہ شادی کہاں کی جائے۔ وہ اپنے بھائیوں تک اپنے خاندان بھر میں نہایت روشن دماغ، آزاد خیال، اور حامیٔ تعلیم و حقوق نسواں تھے۔ بیوی بھی اپنی ہم خیال چاہتے تھے۔ چند دوستوں نے اس زمانے کی ایک آزاد خیال اور حامیٔ تعلیم نسواں لڑکی بنت نذر الباقر[1] کا نام بتایا۔ اس لڑکی کے مضامین کی وجہ سے وہ خود بھی اس سے کچھ واقف تھے۔ اسی وقت ان کے مضامین کا مجموعہ "خیالستان" چھپ کر شائع ہوا اور بنت نذر الباقر کے دو مختصر ناول: "اختر النساء" اور "آہ مظلوماں" اسی زمانے میں چھپے تھے۔ دوستوں کے کہنے سے انہوں نے یہ مشورہ پسند کر لیا اور مدرسۃ نسواں اشمس العلماء مولوی سید ممتاز علی صاحب کے توسط سے میرے والدین کے پاس رشتہ کا پیغام آیا۔

کچھ دنوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے خاندان اور میرے خاندان دونوں نے سخت مخالفت کی اور طرح طرح سے روڑے اٹکائے۔ اس کو بھی کچھ وقت گذر گیا۔ اس زمانے میں ایک بڑا لطیفہ ہوا جس پر بعد میں دوستوں نے ہمیں بہت چھیڑا اور مذاق کیا۔ یلدرم کا ایک مضمون "آہ یہ نظریں"[2] "مخزن" میں شائع ہوا تھا جو کسی حسینہ کی پرکشش آنکھوں سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ واللہ ان کی محبوبہ بالکل خیالی تھی یا یہ کوئی واقعہ کا اظہار ہو چکا تھا۔ ان کی آخری حسرت آمیز اور محبت بھری نگاہیں یاد آ کر مجھے بے چین کئے ہوئے تھیں۔ میں نے بھی "آہ وہ نظریں" کے عنوان سے مال کی محبت بھری اور آخری نظروں پر مخزن ہی میں مضمون لکھا تھا جن لوگوں نے

---

[1] نذر سجاد حیدر مرحومہ کا کنوار پنے کا نام

[2] عصمت کراچی نے اپنے مضمون میں جو اس رسالہ کی نومبر ۸۰ء کی اشاعت میں چھپا ہے نذر سجاد حیدر کے اس مضمون کا عنوان غلطی سے "آہ یہ آنکھیں" لکھا ہے۔

ان کا مضمون پڑھا تھا۔ انہوں نے میرا بھی پڑھا۔ بہرحال کچھ عرصہ تک ان مخالفتوں کا بھی اثر رہا اور شادی نہ ہونے پائی۔ مگر یہ رشتہ بھی غالباً تقدیر کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ باوجود ان سب رکاوٹوں کے ہو کر رہا۔ جون ۱۹۱۲ء میں یلدرم مع بھائی ممتاز علی صاحب اور اپنے بہنوئی وغیرہ کے ہماری جائے قیام ایک سرحدی مقام کوہاٹ تشریف لائے۔ یلدرم اور بنت نذر الباقر کے درمیان عمر بھر کی رفاقت کا عہد و پیمان ہو گیا۔

اہلِ کوہاٹ ان کے لئے بے چینی سے مشتاق تھے۔ علاوہ ان لوگوں کے جو شادی کے کھانے پر مدعو کئے گئے تھے بہت سے ایسے لوگ بھی بن بلائے آ گئے جن کو یلدرم کے دیدار کا ارمان سے اشتیاق تھا۔ جس وقت وہ لوگ پہنچے یہاں کھانا ہو رہا تھا۔ وہ لوگ خاموش باغیچے میں ٹہلتے رہے۔ میرے بابا مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھے اس لئے ان کی نظر اس طرف نہ گئی جب کھانا ختم ہوا اور سب لوگ باغ میں آ کر بیٹھے، جہاں نشست کا انتظام تھا تب بابا دیکھ کر حیران ہو گئے۔ وہاں تو ساٹھ ستر صاحبان موجود تھے۔ جن میں سے بابا کسی کو بھی نہیں پہچانتے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر (جو یلدرم کے زمانے کے پڑھے ہوئے علیگ۔ اور بیرسٹر تھے) یلدرم کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ہنس کر کہا "ہمارے نصیب کہ آپ کوہاٹ تشریف لائے جس طرح آپ کو زیارتِ قاہرہ کی کشش مصر لے گئی تھی۔ ہم کو زیارتِ یلدرم کی کشش 'بنوں' ہنگو۔ وغیرہ سے کوہاٹ لے آئی۔

پھر تو ان کے ساتھیوں کی قطار آگے بڑھ آئی اور یلدرم کو اپنے حلقہ میں لے لیا۔ اس وقت ذرا اندھیرا ہو گیا تھا اور ان لوگوں کو یلدرم کی اور یلدرم کو انکی شکل اچھی طرح دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بیرسٹر صاحب نے قریب ہی سے ایک شمعیں کی لالٹین اٹھا کر ان کے چہرے کے برابر کر دی اور بہ آواز کہا "اے مشتاقانِ دیدارِ یلدرم او بیچئے۔ ع دلِ الکش رخ ترکانہ داری۔ یہ سنتے ہی وہ سب ایک ایک کر کے سید سجاد حیدر یلدرم صاحب کے سامنے آتے اور زیارت کرتے گئے۔

بیرسٹر صاحب بھاری لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ بے سہرے کے دولہا کا ایک تماشہ بن رہا تھا۔ دولہا اس وقت بادامی چائنا سلک کے سوٹ میں تھے۔ باغ میں ہوا سے پیشانی پر گھونگھریالے بال بکھر رہے تھے پر کشش بڑی بڑی آنکھوں پر سنہری عینک چمک رہی تھی۔ میرے بابا بھی اپنے داماد کی اس شان و قدر دانی سے خوش ہو کر قریب ہی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ بھائی ممتاز علی صاحب بھی وہیں کھڑے یہ نقشہ دیکھ رہے تھے۔ جب اس طریقہ سے دولہا کی رونمائی ہو چکی۔ تو بابا نے ان سب بعد کے آنے والوں کو کھانا کھلوایا۔ اور بہ حالات ایک بجے شب کو جب گھر کے اندر آئے میری خالہ جان اور چھوٹی بہن ثروت آرا کو سنائے۔ میں بھی قریب ہی پلنگ پر لیٹی ہوئی سب سن رہی تھی مگر سوتی بن گئی تھی۔

میں نے اب تک سوائے مخزن کی تصویر کے ان کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ دوسرے دن دوپہر کو ہماری پہلی ملاقات مقرر ہوئی تھی۔ اور اسی روز شام کو مسوری روانگی تھی۔ شاید گیارہ بجے ہوں گے کہ ثروت آرا میرے کمرہ میں آئی۔

---

¹ ۱۹۲۵ء میں انتقال ہو گیا۔ شادی ہو چکی تھی۔ مرحومہ کے انتقال پر یلدرم نے ایک پر اثر نظم لکھی تھی خیال ثروت نہال ثروت جس کا ایک مصرعہ زبان پر آ رہا ہے
۶ فاطمہ سے تھا ضیا گیر جمال ثروت

اور گھبراہٹ کے ساتھ کہا "باجی جان! بھائی جان کو اندر بلایا جا رہا ہے۔ آپ سے ملاقات کے لئے" میں نے کہا "ابھی سے ملاقات کی کیا جلدی ہے۔ شام کو تو ان کے ساتھ جانا ہی ہے۔" وہ بولی "نہیں باجی یہ ضروری ہے۔ ماموں جان کی رائے ہے کہ سفر سے پہلے آپس میں روشناسی ہو جانی چاہیئے" میں نے کہا "آخر تم نے ایسا بھاری جوڑا کیوں پہنا ہے؟" اس نے ہنس کر جواب دیا "لیجئے آج ہی اچھا جوڑا نہ پہنتی تو کب پہنتی؟ آج اپنے دولہا بھائی سجاد حیدر یلدرم[1] سے پہلی بار ملنا ہے جن ملاقات کے شوق میں ۱۹۰۸ء سے بے چین تھی۔ خالہ جان، پھوپی جان بھی تو آ رہی ہیں۔ سب اکٹھے ہی ملیں گے۔ آپ ذرا اچھے طریقے سے بیٹھ جایئے۔ چھوٹے میاں انہیں بلانے باہر گئے ہیں۔"

اب میں حیران! ایک پردہ دار ہندوستانی لڑکی پہلی بار ایک غیر شخص سے کس طرح ملوں؟ جو بالکل اجنبی بھی ہے اور سب سے زیادہ اپنا بھی! اتنے میں خالہ اور پھوپی جان کمرہ میں آ گئیں۔ پھوپی نے مجھے صوفہ پر بٹھا دیا۔ جارجٹ کے دوپٹہ سے سر کو اچھی طرح ڈھک دیا۔ گھونگھٹ نہیں نکالا گیا۔ میرے قریب ہی ثروت آرا کو بٹھا دیا گیا۔ خالہ نے ہنس کر کہا "دونوں ایک سی ہی ہیں، سجاد کیسے پہچانیں گے۔ کہ بیوی کون ہے اور سالی کون سی" کیوں کہ میرے سر پر جھومر اور ٹیکا تو تھا نہیں اور نہ ناک میں نتھ۔ سفید پھولدار ریشمی جوڑا اور ہلکا گلابی دوپٹہ بلکہ مجھ سے زیادہ شوخ اور بھاری جوڑا ثروت کا تھا۔ اب یہ سوچا جا رہا تھا۔ کہ مجھ میں کیا خصوصیت پیدا کی جائے جو دلہن معلوم ہونے لگوں۔ پھولوں یا سہرے کا تو کیا ذکر میرے ہاتھوں میں مہندی بھی نہیں لگی تھی۔

پھوپی جان نے جو میری دوست بھی تھیں جلدی سے میرے لباس اور رومال پر سینٹ چھڑکا اور میرا سر ذرا جھکا دیا۔ نگاہیں خود بخود نیچی ہو گئیں میرے جسم میں ایک کپکپی سی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ کیا کرنا چاہیئے۔ باتیں کی جائیں یا عام دلہنوں کی طرح چپ لگ رہا جائے۔ وہ کیا خیال کریں گے۔ میں نیچے کی طرف قالین کے پھولوں اور اپنی ہائی ہیل کی روپہلی چمکتی جوتی کو دیکھ رہی تھی۔ اور وہ تینوں چشم براہ تھیں، کہ پردہ ہٹا۔ پہلے میرا بھائی جو الیف اے کا طالب علم تھا یعنی افضل علی عرف چھوٹے میاں، داخل ہوا اور بشاشت سے کہا "بھائی جان آ جائیں"۔ "ہاں ہاں" فوراً پھوپی نے جواب دیا۔ وہ نیچے منتظر تھے۔ اندر آئے۔ سب کو سلام کیا۔ خالہ جان کے کہنے سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے جو نہایت خوب صورت کشنوں سے سجی تھی اور اس کے تکیہ اور ہتھوں پر پھولوں کے ہار مہک رہے تھے۔

انہوں نے ہم دونوں کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نگاہ کی (یہ مجھ کو بعد میں افضل علی نے بتایا تھا) اور خالہ پھوپی جان سے مخاطب ہو گئے۔ کیوں کہ ان سے ایک بار ماہ مئی میں بھی مل چکے تھے۔ جب وقت صرف عقد کے لئے آئے تھے۔ ثروت آرا اس وقت مل نہ سکی تھی کہ بیمار تھی۔ ۱۷ رجون کو ہاشم کے تپتے ہوئے پہاڑوں کی گرمی ۱۲ بجے دن کا وقت۔ کو نیچا میں رہا تھا۔ مگر شدت سے گرمی تھی۔ وہ بار بار پانی مانگ کر پی رہے تھے۔ ثروت کوئی پندرہ منٹ تک خاموش ان کو تکتی رہی بہت بے باکی سے اور یہ بھی سنا کہ بار بار کنکھیوں سے ثروت کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ آخر اس سکوت کو توڑنے اور ثروت نے سے ہم کلام

[1] بعد میں اپنے زمانے کے معروف انشا پرداز ہوئے۔

ہونے کی پہیلی انہوں نے ہنستے ہنستے ہی بوجھ لی تھی کہ اس کے بار بار دیکھنے اور میری نیچی نظریں بلکہ سر اور گردن بھی جھکی دیکھ کر وہ سمجھ گئے۔ کہ بھڑکیلے لباس والی ہی سالی ہے۔

سلسلہ گفتگو یوں شروع کیا "اب تو آپ کی صحت درست ہے؟ مئی میں جب میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت طبیعت ناساز تھی"؟

وہ تو منتظر ہی تھی کہ بہنوئی یلدرم کسی طرح بات کریں فوراً جواب دیا "جی ہاں، بہت ہی بیمار تھی، تب ہی تو اس وقت آپ سے نہ مل سکی تھی۔ اب تو بہتر ہوں۔ مگر آج گرمی غیر معمولی پڑ رہی ہے۔ یہاں کے ریتیلے میدان جب تپتے ہیں تو غضب ہوتا ہے۔ آپ پہاڑ سے تشریف لا رہے ہیں۔ بہت ہی گرمی اور پیاس محسوس کر رہے ہوں گے۔ دیکھئے ذراسی دیر میں پانی کا جگ خالی کر دیا"۔

یہ نوک جھونک سن کر ہنسنے لگے اور کہا "بے شک میں بہت پانی پی رہا ہوں۔ باہر بھی ٹوکا گیا ہوں۔ شدت کی پیاس ہے"

جب سالی بہنوئی باتیں کرنے لگے تو خالہ پھوپی جان یہ کہتی ہوئی اٹھ گئیں کہ "اب کھانا بھجوایا جاتا ہے۔ پانی پی لیا تو کھانا مشکل ہو جائے گا"۔

ثروت نے وہ برف کا جگ میز سے اٹھا لیا۔ اور کھانے کی جگہ پہ بنا دو چھوٹی میزیں جوڑ کر نوکرنی کھانا لے آئی تو وہ بولے "آپ بھی کھائیں گی نہ؟" ثروت یہ کہتی ہوئی کھڑی ہو گئی کہ "نہیں بھائی جان میری چند دوست مہمان آئی ہوئی ہیں" یہ کہہ کر وہ بھی چل دی۔

اب یلدرم میری طرف متوجہ ہوئے۔ اپنی کرسی صوفے کے قریب کر کے فرمایا "السلام علیکم! شدت کی گرمی ہے۔ ذرا چہرے سے رومال ہٹا کر رخ میری طرف کیجئے"۔

بہت ہمت سے کام لے کر میں نے ذرا چہرہ اونچا کیا۔ مگر نظریں فرش پر گڑی رہ گئیں۔ انہوں نے میرے ہاتھ سے رومال چھین لیا اور مسکرا کر فرمایا "اب تو پردہ کا بے پردہ نشین دیکھ لیا"! پھر کھانے کی میز آگے کو بڑھا کر کہا "شروع کیجئے" اور خود مچھلی کا کباب اٹھا لیا۔

میں اس گھڑی سخت مشکل میں پھنسی تھی۔ اگر ان کی آزاد خیالی پر اعتماد کر کے بے تکلفی سے کھاتی ہوں تو دل میں کہیں گے کہ کس قدر بے تکلف دلہن ہے...... کی پرورش کا اثر ہے۔ اور اگر شرم کا اظہار کروں تو "دیہاتی، پرانی، پابند رسوم" خیال کریں گے۔ بہ دقت تھوڑا سا کھایا۔ وہ باتیں کرتے رہے، میں آہستہ آہستہ جواب دیتی رہی۔

یہ تھی ہماری اوّلین ملاقات۔ اگر شادی سے پہلے کبھی ملاقات کا موقع ملتا بحیثیت ایک اجنبی ادیب اور افسانہ نگار کے تو خدا جانے کتنی باتیں ہوتیں۔ یلدرم کو دیکھنے یلدرم سے ملنے کا مدت سے اشتیاق تھا۔ مگر ملنا نہ ہوا اور آج وہ زریں وقت ملا تو کسی اور ہی عالم میں۔ جس وقت کہ آزاد سے آزاد اور بے باک سے بے باک لڑکی بھی قدرتاً شرما جاتی ہے۔

ابھی کھانا ہو ہی رہا تھا۔ کہ باہر سے بلاوا آگیا۔ ان کے منجھلے ماں دیدار جون کی گرم دوپہر میں آگئے۔ میرے پاپا نے بلوا بھیجا۔ کیونکہ آج شب کو کوہاٹ سے روانگی تھی۔ پھر شام کی چائے باہر سب کے ساتھ پی کر چھ بجے کے قریب اندر بلائے گئے۔ اس وقت مجھ کو خاص طور پر دولہن بنایا گیا تھا۔ مگر جدائی کا وقت قریب تھا۔ میں بے حد افسردہ تھی۔ ثروت اور زہیوفی صاحبہ نے ایک خوبصورت صندلی رنگ کا جوڑا پہنایا جس پر ہلکا ہلکا زری کا کام تھا۔ زیور بھی لاد دئے گئے۔ سات بجے کے قریب سب سے رخصت ہو کر اپنے پاپا کا نو ایجاد کردہ برقعہ پہن کر اسٹیشن روانہ ہوئی۔ بے شمار لوگ اسٹیشن پر آئے تھے اور سب ہی غمگین تھے۔

گاڑی ہلی۔ میرا دل۔ ہل گیا۔ کوہاٹ چھوٹ گیا۔ وہ اندر آکر میرے پاس بیٹھے۔ مگر میری حالت خراب تھی۔ ان کا بھی چہرہ مکدر و افسردہ تھا۔ آنکھیں نمناک، پسینہ پسینہ تھے۔ مجھ کو بہلانے کی یہ ترکیب نکالی بولے "میرے سر میں سخت درد ہے۔ یہاں گرمی کی شدت سے سر پھٹا جا رہا ہے" یہ سن کر میں آنکھیں خشک کر کے اٹھ بیٹھی اور کہا "تھوڑا شربت پیئیں یا آئسکریم کھائیں گرمی سے درد ہے۔" مسکرا کر بولے "آئس کریم ابھی چائے کے بعد کھائی ہے۔ پانی پی کر تو میں تھک گیا ہوں۔ میں نے آنکھیں جھکا کر کہا: "لیٹ جائیے میں سر دبا دوں"

... یہ سنتے ہی فوراً اپنی سیٹ پر لیٹ گئے۔ اور میرے دوپٹے کا آنچل اپنے ہاتھ میں لے کر ذرا ترنم سے فرمانے لگے "یہ صندلی دوپٹہ میرے سر سے باندھ دو۔" شب کی سیاہی پھیل چکی تھی۔ برقی پنکھا بھی چل رہا تھا۔ درجہ کی ایک دو کھڑکیاں بھی کھلی تھیں۔ تاہم کمرے میں حبس محسوس ہو رہا تھا۔ اگرچہ مجھے ابھی اٹھنا ذرا دشوار سا تھا۔ لیکن ان کے سر کے درد کے خیال سے اٹھی۔ اور سب کھڑکیاں کھلوا دیں۔ وہ اپنی برتھ پر اسی طرح نیم دراز ماتھے پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ کوئی مصرعہ گنگنا رہے تھے۔ میں پھر قریب آکر بیٹھ گئی تو مسکراتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر میرا صندلی رنگ کا دوپٹہ ہاتھ سے کھینچ لیا۔ اور اسی طرح نہایت ملاحت اور ترنم سے وہی مصرعہ دہرایا "یہ صندلی دوپٹہ میرے سر سے باندھ دو" میں نے آہستہ سے جواب دیا "یہ دوپٹہ صندل میں رنگا ہوا یا لیا ہوا نہیں ہے معمولی بازاری رنگ ہے"

"مرض درد اور صندلی رنگ کا آپ کا خوشبودار کپڑا ہمارے لئے تو اصل صندل سے زیادہ اثر رکھتا ہے" یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرا دوپٹہ کھینچ کر اپنے سر سے لپیٹ لیا۔ میں نے قریب ہی کھونٹی سے دھانی دوپٹہ اتار کر اوڑھ لیا۔ ان کپڑوں میں سے جو سفر میں بدلنے کے لئے بکس سے نکال کر کوہاٹ سے گاڑی کے چلتے وقت خدا جانے کس نے کھونٹی پر ٹانگ دیئے تھے، اور اٹھ کر اپنے اٹیچی کیس سے یوکلپٹس کی خوشبو والا رومال، جس کا رنگ ہلکا بادامی تھا، نکال کر ان کے قریب آئی۔ اور اپنا دوپٹہ سر سے ہٹا کر وہ باندھ دیا۔ "ارے یہ کہاں سے آگیا؟" وہ بولے۔ میں نے بتایا "گھر سے چلتے وقت میرے سر میں بھی سخت درد تھا۔ تو پھوپی جان نے یہ لپیٹ دیا تھا۔ میں نے کہا ہی درد و بخار ہو، سر سے کبھی کچھ نہیں باندھا عادت ہی نہیں۔ اُسی وقت کھول کر رکھ دیا تھا" یہ سنتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے "اوہو! یہ تو اس سے بھی زیادہ موثر ہے"

اپنا سر نیچے کو جھکا دیا۔ اور میں نے ذرا ہچکچاتے ہوئے وہ ان کے سر پر لپیٹ دیا۔ پھر فرمایا اس درد کمبخت نے آپ کو بے وقت بہت تکلیف دی ۔

اب تو اچھی خاصی رات ہو گئی تھی۔ کھڑکیوں میں سے چاند کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ وہ خود ایک کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گئے۔ اپنی عینک اٹھا کر لگالی۔ اور مجھ سے وہیں بیٹھنے کو کہا۔ بیٹھ گئی۔ اب چاند بالکل ان کی کھڑکی کے مقابل تھا۔ چاندنی ان کے چہرے پر پڑ رہی تھی عینک کا فریم چمک رہا تھا۔ آج وہ بالکل نئے نوشہ تھے مگر نہ شملہ سر پہ بندھا تھا نہ سہرا۔ مجھے یہ خیال آ ہی رہا تھا کہ ان کا بھی ذہن اس لمحے اس طرف گیا۔ مجھ سے ہنس کر کہا "بیلے اور چنبیلی کی خوشبو سے بھی تو سر کے درد کو آرام ہوتا ہے"۔ ہمارے درجہ میں اس وقت پھولوں کا انبار تھا۔ میرے پاپا کے دوست ان کے اور میرے لئے رخصتی ہار لائے تھے۔ میں ان ہی میں سے پھول لینے کو اٹھنے لگی۔ وہ فوراً سیدھے ہو کر بیٹھے۔ اور میرے سر میں اور جوڑے کے گرد جو پھول لپٹے گئے تھے ان میں سے ایک ہار کھول لیا وہ بھی اپنے سر کے رومال پر لپیٹ لیا۔ باقی کے میں نے خود اپنے سر سے اتار دیئے۔

مجھے کبھی پھول اور عطر کا شوق نہیں رہا۔ گلے میں پھولوں کا ہار میں نے کبھی نہیں پہنا۔ آج بھی گھر سے چلتے وقت جب مجھے دلہن بنایا گیا۔ تو میں نے گلے میں ہار نہیں ڈالنے دیا۔ زبردستی پھوپی جان اور میری ایک دوست لڑکی شریفہ نے دو ہار سر پر چڑھا دیئے۔ ایک جوڑے کے گرد اور ایک داؤنی زہر کا ایک جڑاؤ زیور کے برابر باندھ دیا۔ مجھے وہ ہٹاتے دیکھ کر بولے "یہ میرا سر سے پھول اتار لینا آپ کو کچھ ناگوار ہوا؟" گو میرا دل اسی وقت سخت غمگین تھا۔ میں سب کو چھوڑ کر آئی تھی۔ چھوٹا سا کوہاٹ، اس کی عمارات اور پہاڑیاں دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے خیال سے اپنے کو سنبھالے ہوئی تھی۔ میں نے فوراً ہنس کر جواب دیا "ہرگز نہیں" مجھے پھول پہننا بالکل پسند نہیں۔ دیکھئے آج بھی گلے میں کوئی ہار نہیں۔ یہ تو میری ایک دوست نے روتے ہوئے جبراً میرے سر سے لپیٹ دئیے تھے۔ کہ یہ میری نشانی آپ کے پاس رہے گی۔ پھر میں نے دوسرا ہار بھی ان کے رومال پر لپیٹ دیا۔ وہ ہنسے اور بولے "اچھا ہوا اس وقت یہ سہرے کی رسم بھی پوری ہو گئی۔"

اسٹیشن پر پاپا کے بے شمار دوست، صاحبان جو پھول لائے تھے ہر ایک ہار میرے گلے میں ڈالنا چاہتا تھا۔ مگر پاپا نے سب کو روک دیا تھا کہ غضب کی گرمی ہے۔ اس پر یہ پھولوں کے ہاروں کا جنجال بہت تکلیف دے گا۔ اسٹیشن کا ذکر آتے ہی میرا دل پھر ان ہی خیالات میں ڈوب گیا۔ میں نے باہر کھڑکی کی طرف رخ کر لیا۔ شاید انہوں نے میری پرنم آنکھیں دیکھ لیں اور کھڑکی سے باہر چاند کی طرف دیکھ کر کہا "دیکھئے آج شاید چودھویں کا پورا چاند ہے" گاڑی کوہاٹ کے شہر سے بہت دور نکل آئی تھی اور دونوں طرف پہاڑ ہی پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ ان پہاڑوں پر آخری نظر ڈالتے ہوئے میرا دل بہت بے چین تھا۔ اب وہ میرا خیال ادھر سے ہٹانا چاہتے تھے ورنہ میں اپنا چہرا کھڑکی سے باہر کئے ہوئے تھی۔ میرا ہاتھ جو دریچہ پر رکھا ہوا تھا اسے ملا کر کہا "گھڑی دیکھ کر وقت تو بتائیے کہ کیا بجا ہوگا؟" میں اپنی دلی

کیفیت چھپانے کے لئے خاموش تھی۔ وہ بھی اس کو بھانپ رہے تھے۔ آخر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ اندر کی طرف کرکے کہا "کیا ناراض ہو گئیں؟ نہیں میرا خیال غلط ہے۔ ایک دن کی دلہن بھی کہیں ناراض ہوا کرتی ہے۔" اُن کے مطلب کو سمجھ کر مجھے بے اختیار تھوڑی سی ہنسی آگئی اور میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ خود بھی مسکراتے ہوئے میری طرف انگلی سے اشارہ کرکے ترنم سے کئی بار یہ الفاظ دہرائے۔ "اے لو وہ لب پہ آئی ہنسی۔ دیکھو وہ مسکراتے ہیں۔" ان کی کوشش کامیاب ہو، یہ خیال کرکے مجھے ہنسی آہی گئی۔ پھر فرمایا "یہ جنگل کی تازہ ہوا اور شریفہ کے محبت بھرے پھولوں کی خوشبو۔ کسی کی بالوں کی صندلی خوشبو سے مہکا ہوا رومال میرے سر کا درد اب بالکل جاتا رہا۔"

میں نے فوراً وہ رومال اور ہار سر سے اتار لیا۔ اور ان سے پوچھا "اب آپ کو کھانا کھانا چاہیئے نو بج چکے ہوں گے۔" "صرف مجھ ہی کو کھانا چاہیئے؟ آپ کا ارادہ نہیں؟" انہوں نے جواب دیا۔ "میرا تو بالکل جی نہیں چاہتا۔" شام کی چائے بہت دیر میں پی تھی۔" میں نے کہا۔ وہ بولے "بس تو ہمیں بھی بھوک نہیں ہے۔" چونکہ یہ ایک گاڑی تھی۔ چھوٹے اسٹیشن سب چھوڑتی چلی آرہی تھی ماتھی کو ہاٹ کے بعد کسی اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ میں نے ان سے کہا "آپ نے دیکھا ہوگا میرے ساتھ ایک ملازمہ بھی آئی ہے۔ تکلیف کرکے ذرا اُسے سروینٹ سے بلا لیں تو وہ کھانا کھلا دے گی۔" انہوں نے کہا "وہ اب سو گئی ہوگی۔ کھانا ہم خود ہی کھالیں گے" اور اٹھنے لگے۔ ٹفن تو کری کھول لی۔ مجبوراً میں کھڑی ہو گئی۔ وہ خود ٹو کری اٹھالائے۔ میں نے پلیٹوں میں کھانا نکال کر رکھا۔ کھانا کیا کس سے جاتا تھا۔ کل اس وقت کے کھانے کا منظر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ سجاد صاحب نے مزاحیہ میں پایا کہ دوستوں کے ساتھ کھانا کھایا تھا اور میرے ساتھ کھانے پر میری خالہ جان پھوپی جان اور شروت آرا کے علاوہ میری دو شریفہ اور اس کی والدہ اور بہنیں وغیرہ سب تھیں۔ بہرحال ان کے اصرار پر تھوڑا سا کچھ کھا لیا۔ انہوں نے بہت تعریفیں کر کرکے کھانا کھایا۔ پھر میں نے برتن سمیٹ دئیے۔

ہاں درمیان میں جب دوسرے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری۔ تو بھائی مولوی ممتاز علی صاحب اور ان کے بہنوئی[1] سید برہان حیدر صاحب کے لئے کھانا دوسرے درجہ میں بھیجا۔ وہ دونوں سجاد صاحب کو کچھ ناخوش سے نظر آئے۔ دوسرے دن صبح معلوم ہوا کہ برہان حیدر چاہتے تھے کہ مجھ سے ان کی اسی شام ملاقات کرائی جائے مگر سجاد صاحب نے میری پریشان حالت کو دیکھ کر یہی مناسب سمجھا کہ دوسرے دن صبح انہیں ملایا جائیگا۔ چنانچہ صبح ناشتہ کے بعد جب سجاد صاحب ان دونوں کو مجھ سے ملانے کے لئے بلانے گئے۔ تو یہ جواب ملا "اب ایسی کیا جلدی ہے۔ مسوری ہی پہنچ کر ملیں گے۔" انہیں بہت افسوس ہوا اور یہ سب کچھ مجھ سے کہہ دیا۔ تب میں نے کہا "پھر آپ کل شام ہی انہیں بلا لائے ہوتے۔" انہوں نے جواب دیا۔ "وہ وقت کہیں ملاقاتوں کا تھا۔ آپ گھبرائی ہوئی پریشان سی بے حد پریشان نظر آرہی تھیں۔ باہر جب قدسیہ جان ہمیں رخصت کرنے

[1] یعنی پدرم کے بہنوئی

آئے تھے۔ سب ہی مغموم تھے اور میری طرف متوجہ تھے۔ میں سب کو چھوڑ کر اپنے بہنوئی صاحب کو پہلی ملاقات کے لئے بلا لاتا۔!

اب یہاں سے چل کر گاڑی راولپنڈی کے بڑے اسٹیشن پر ٹھہری۔ وہاں بھی پاپا کے کئی دوست ہمارے لئے کھانا، پھول، مٹھائیاں اور برف وغیرہ لئے کھڑے تھے اور میرا عزیز بھائی بلی رام میرے لئے ایک بیش قیمت جوڑا کپڑا اور لہنگا اور کامیتی طلائی جوتہ لایا۔ بچپن سے میں بلی رام صاحب کو بھائی کہتی تھی۔ یہ میرے پاپا کے مدتوں سے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔ آج کل راولپنڈی میں کمرشیٹ ایجنٹ ہیں۔ ان سب صاحبان سے میرا پردہ تھا۔ جیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا۔ مگر سجاد صاحب کی حالت تھی کہ ان سب کو گاڑی میں لا کر مجھ سے ملانا چاہتے تھے اور وہ بے چارے گھبرائے جاتے تھے۔ جب ہم دونوں بہنیں ذرا سیانی ہو گئی تھیں، تو پاپا صاحب اور خالو جان کے حکم سے سب ایسے بچاؤں اور بھائیوں سے پردہ کرا دیا گیا تھا، حالانکہ میرے پاپا اس کے بالکل خلاف تھے۔ لیکن بڑے بھائی اور بھاوج سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ لوگ اندر آتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ آخر میں نے آہستہ سے کہا "آپ ان سب کو کیوں پریشان کر رہے ہیں۔ میرا مدتوں سے ان سب سے پردہ ہے"۔ وہ مجھ سے یہ سن کر کچھ مسکرائے۔ شاید ان کا یہ خیال تھا کہ میرا پردہ تو نہیں ہے لیکن ان کی وجہ سے کہا جا رہا ہے۔ کیوں کہ تعلیم نسواں کے خلاف لوگوں نے یہ مشہور کیا تھا۔ اور ان تک پہنچا دیا تھا کہ بہنت نذر الباقر بہت آزاد ہیں۔ گھوڑے اور سائیکل پر باہر نکلتی ہیں۔ باپ کے سب دوستوں سے ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے میرا یہ خیال ہوا کہ وہ سب کو مجھ سے ملوانا چاہتے تھے۔ مگر میں دوسری طرف کو جھک گئی۔ اور ان میں سے ایک چچا عطا محمد صاحب نے ان سے کہا "آپ تکلیف نہ کیجئے۔ بیٹی بہت شرمائی ہے۔ وہ ہمارے سامنے نہ ہوں گی"۔ پھل اور مٹھائی کے اس قدر ٹوکرے آئے تھے کہ ہمارا درجہ بھر گیا۔ آخر مجبور ہو کر سجاد صاحب بھی گاڑی سے اتر کر انہیں میں جا کر کھڑے ہوئے۔ تھوڑا سا وقت تھا باتیں ہونے لگیں۔ بھائی بلی رام نے بہت شرماتے ہوئے نیچے کو منہ کر کے ایک انگوٹھی سجاد صاحب کی انگلی میں پہنا دی۔ اور میرے لئے ایک جوڑی بنا کے انہیں دے دئے اب سامنے سبز جھنڈی نظر آئی۔ اور گاڑی نے جنبش کی۔ جلدی سے سجاد صاحب اندر آ گئے۔ سب ہاتھ اور رومال ہلاتے رہ گئے۔

گاڑی اسٹیشن سے نکل آئی تو پھر وہ آ کر میرے قریب بیٹھے اور کہا "یہ اس قدر تحائف کا ہم کیا کریں گے۔ یہ دیکھئے آپ کے بھائی نے کیسے خوبصورت ایرنگ دئے ہیں"! پھر ہاتھ بڑھا کر انگوٹھی دکھائی۔ سب ہی راولپنڈی والے بے تحاشا چیزیں لے آئے تھے۔ بلی رام صاحب کو بہت افسوس رہا کہ وہ شادی میں کوہاٹ نہ پہنچ سکے۔ اب کھانے کا وقت آ گیا تھا ہمارے ساتھ کا کھانا تو باسی ہو چکا تھا۔ یہ سب تازہ لائے تھے۔ ثابت مرغ کے کباب، پلاؤ، قیمے کے کباب، کسی کا زردہ تھا۔ کسی کی پڈنگ اور بے شمار مٹھائیاں اور پھل۔ جو میرے ساتھ آئی تھی وہ عورت بھی اس وقت درجہ میں تھی۔ جس قدر اس سے ہو سکا سنبھالا۔ کھانا اور پھل وغیرہ نکال کر بھائی مولوی صاحب اور ان کے بہنوئی برہان حید ر صاحب کے لئے دوسرے

درجہ میں بھیجا گیا اور اس عورت نے ہمارے لئے کھانا چنا۔ برف کی سلیں تھیں جو ہم نے سرونٹ میں بھجوا دیں اور کچھ پھینک دیا کیوں کہ گاڑی میں پانی پانی ہوا جاتا تھا اور بھیگی جاتی تھی۔

یہاں سے چل کر گاڑی چک لالہ ٹھہری۔ سجاد صاحب نے کھڑکی سے دیکھا۔ وہاں بھی تین چار صاحب شلواریں پہنے، سر پر لنگی کلاہ، کھڑے تھے۔ گاڑی ٹھہرتے ہی وہ کچھ آگے بڑھے۔ بہت سی کھانے پینے کی چیزیں ان کے ساتھ ملازم اٹھائے ہوئے تھے۔ سجاد صاحب نہ پہچان سکے۔ مگر انہوں نے بتایا کہ "ہم لوگ منی میں کوہاٹ گئے تھے جب آپ پہلی بار کوہاٹ تشریف لائے تھے"۔ یہ فوراً گاڑی سے اترے۔ ان سے ملے اور ان کے تحفے اندر بھجوائے جن میں ایک قیمتی کنگھی اور ایک اعلیٰ درجہ کا کلاہ، یہ کابلی تحفہ سجاد صاحب کے لئے چچا گل محمد خان صاحب لائے تھے۔ وہ پشاور میں رہتے ہیں۔ مگر آج چک لالہ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے سجاد صاحب سے ہنستے ہوئے کہا: "آپ تو اس کو کیا پسند کریں گے مگر ہمارے یہاں کا دستور ہے کہ داماودں کو لنگی کلاہ دیتے ہیں۔"

سجاد صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ دونوں چیزیں ان سے لے لیں اور کہا: "آپ کی محبت اور عنایت کا میں شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ یہ تو مجھے بہت پسند ہے۔ میں ضرور پہنوں گا۔" پھر چچا گل صاحب نے اشارہ کیا۔ ایک نوکر ایک کاغذ کا بکس ہاتھ میں لئے آگے بڑھتا۔ وہ بولے "یہ ہماری بیٹی جنت نذر الباقر کو ان کی چچی نے بھیجا ہے۔" سجاد صاحب نے اس پٹھان ملازم سے کہا "اندر لے جاؤ"۔ وہ رکا۔ میں نے اندر سے اپنی ملازمہ کو دروازے میں بھیجا کہ وہ لے لے۔ گاڑی چلنے لگی وہ اندر آ گئے۔ میں نے بکس کھولا۔ اس میں یہ چیزیں تھیں۔ ایک کار چوبی دوپٹہ، قمیص، اور اطلس کی ریشمی شلوار اور پشاوری طلائی جوتا (ایک قسم کا جوتا جس کی ایڑی اونچی ہوتی ہے اور سلیپر نما) انہوں نے مجھ سے پوچھا "آپ شلوار بھی پہنتی ہیں؟" مجھے ہنسی آئی اور جواب دیا "میں نے تو کبھی نہیں پہنی۔" لیکن انہوں نے اپنے شہر کا لباس بھیجا، بہت خوبصورت اور قیمتی دھانی رنگ کا جوڑا تھا۔

اسی طرح جہلم اور لالہ موسیٰ پر بھی چند لوگ معہ ناشتہ کے آئے اور گجرات پر گاڑی ابھی ٹھہرنے بھی نہیں پائی تھی۔ کہ میرے عزیز چچا جناب شیخ محمد علی صاحب مسکراتے ہوئے ہاتھ میں کوئی سنہری چیز لئے گاڑی کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ ٹھہرتے ہی سجاد صاحب جلدی سے نیچے اترے۔ چچا نے سجاد صاحب کو سینے سے لگا لیا۔ پھر وہ زیور ان کے ہاتھ میں دیا "یہ بیٹی کو ان کی چچی نے بھیجا ہے۔ وہ خود بھی اسٹیشن آ رہی تھیں مگر لڑکی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی اس لئے نہیں آسکیں۔" سجاد صاحب کو یہ علم تھا کہ چچا محمد علی صاحب بالکل میرے حقیقی چچا کے برابر تھے۔ انہوں نے اپنے چچا کا ہاتھ پکڑ لیا "آپ خود ہی اندر تشریف لا کر ان کو پہنا دیں۔" وہ ذرا ہنسے اور کہا "ابھی شادی ہوئی ہے، وہ بہت شرمائے گی۔ آپ ہی دے دیجئے۔ اور ہم دونوں کی طرف سے دعائیں کہئے۔ باقر نے تو مجھے خبر ہی نہیں دی۔ وہ تو ایک دوست رات پنڈی سے مہمان آئے۔ تو انہوں نے بتایا کہ آپ آج یہاں سے گزرنے والے ہیں۔ ان کی چچی کو اس وقت نہ ملنے کا بہت افسوس ہے۔" سجاد صاحب بولے "اب آپ دونوں مری تشریف لائیے۔ تو ہمیں بہت خوشی ہو گی"۔ بس اتنے میں گاڑی چل پڑی۔ جلدی سے سوار ہو گئے۔ چچا ہاتھ ہلاتے رہ گئے۔ اس وقت تو مجھے بھی بہت افسوس ہوا کہ اب یہ چچا بھی مجھ سے چھوٹے۔

وہ اندر آگئے۔ میں بہت افسردہ بیٹھی تھی۔ "آپ تو کچھ بہت پریشان سی ہیں۔ دیکھئے آپ کے چچا یہ کیسا خوبصورت ہار دے گئے ہیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ خود ہی پہنا تے۔ مگر انہوں نے منظور نہ کیا۔ میں پہنا دوں؟ آپ کو ناگوار تو نہ ہوگا۔؟" میں نے ان کے قریب کو سر جھکا دیا تو انہوں نے ست لڑا جس میں سات چھوٹی چھوٹی جگنیاں جڑی تھیں میرے گلے میں ڈالدیا اور وہیں سے آئینہ اٹھا کر میرے منہ کے سامنے کر کے بولے "دیکھئے تو کتنا اچھا ہار ہے"۔ مجھے ہنسی آگئی۔ پھر پوچھا "اب تو کچھ گھنٹے بعد لاہور ہی پہونچیں گے۔ وہاں بھی کچھ لوگ ضرور آئیں گے؟" "جی ضرور۔ وہاں تو کئی میری دوست آئیں گی۔ وحیدہ بیگم بھی ہوں گی۔ پاپا کسی کو اطلاع نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ اس گرمی میں تکلیف اٹھائیں لیکن ایک نے ایک کو لکھ دیا۔ پنڈی والے لوگ کوہاٹ سے ہی خبر لے آئے تھے۔ پاپا کے دوست بہت ہی خوش اخلاق اور مخلص ہیں"۔

"آپ تو کسی سے ملی ہی نہیں" سجاد صاحب بولے۔ "ان سے کہتیں کہ آج کل بہت گرمی ہے۔ وہ ہم سے ملنے مسوری آئیں"۔ میں نے کہا "اس قدر جلدی بھلا بیٹی کے گھر کون آتا ہے"۔ اب وہ لیٹ گئے۔ میں اخبار پڑھنے لگی۔ دل کوہاٹ میں تھا[ل]...

[ل] یہ مضمون یہیں تک لکھا گیا تھا۔ (ادارہ)

خطبات عبدالحق
بابائے اردو

یہ بابائے اردو کی صدارتی تقریروں اور لیکچروں کا مکمل مجموعہ ہے جس میں اردو زبان و ادب کے مختلف مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا پیش لفظ ہے۔ قیمت: نو روپے

سب رس
ملا وجہی

یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے۔ اردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب بہت محنت اور تحقیق کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا محققانہ مقدمہ اور آخر میں فرہنگ الفاظ بھی شامل ہیں۔ قیمت: چھ روپے

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی
میر انشاء اللہ خاں انشاء دہلوی

یہ ایک دلچسپ کہانی ہے جسے انشاء اللہ خاں نے ایک خاص پیرائے میں اس طرح لکھا ہے کہ عربی اور فارسی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا۔ بابائے اردو نے اسے مرتب کیا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو بابائے اردو روڈ کراچی ۱

تحفۂ مقالہ

فارسی زبان وادب

یہ رسالہ "اردو" کے ایسے مضامین کا انتخاب ہے جو فارسی زبان وادب سے متعلق ہیں۔ یہ انتخاب ممتاز ماہر ایرانیات سید حسام الدین راشدی نے کیا ہے۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل مقالے شامل ہیں:

- تصنیفات شیخ فریدالدین عطار — حافظ محمود شیرانی۔
- شاہنامے کا دیباچۂ قدیم — حکیم شمس اللہ قادری
- فردوسی کا مذہب — پروفیسر شیخ محمد اقبال
- رباعیات عمر خیام — عبدالباری آسی لکھنوی
- فارسی زبان کے زیر سایہ اردو کی تدریجی ترقی — ڈاکٹر سید عبداللہ
- نواب صمصام الدولہ شہنواز خاں (مصنف مآثر الامرا) — محمد حسین محوی صدیقی

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ - ۲

کراچی نمبرا

گوہر نوشاہی

واسوخت راحت

آغا محمود بیگ نام اور راحت تخلص تھا۔ والد کا نام احمد بیگ[1] اور آبا و اجداد کا وطن روم تھا[2]۔ دہلی کے محلہ فراش خانے میں رہتے تھے[3]۔ سپاہی پیشہ اور جوان مرد تھے[4]۔ شعر و ادب کا ذوق ابتدا سے تھا اور شاعری میں حکیم مومن خاں مومن دہلوی (متوفی ۱۸۵۲ء) سے اصلاح لیتے تھے[5]۔

بھرت پور کی لڑائی (۱۸۲۶ء) سے کچھ عرصے قبل لفٹیننٹ کرنل جیمز سکنر کے رسالے میں شامل ہوئے[6]۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ کیونکہ فریزر نے انھیں دیکھ کر ان پر دودھ پیتے بچے کی پھبتی کسی تھی۔ اسی جنگ میں فریزر نے ایک چھوٹی سی بات پر خوش ہو کر انھیں دفعداری دے دی تھی[7]۔

۱۸۳۷ء سے بہت پہلے راحت نے سکنر کی ملازمت ترک کر دی تھی۔ کیونکہ یہ سال اکبر شاہ ثانی، بادشاہ دہلی کی وفات کا ہے اور ایک حکایت میں راحت نے خود کو بادشاہ کی طرف سے مکند پور علاقہ ریوان کا عامل لکھا ہے[8]۔ راحت، اکبر شاہ ثانی کے پوتے مرزا شاہرخ (متوفی ۱۸۴۷ء) کے مصاحب تھے[9]۔ اکبر شاہ ثانی کی وفات (۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) سے چند ماہ قبل وہ دہلی چھوڑ کر بھوپال آ گئے۔ جہاں نواب جہانگیر محمد خاں دولہ شمشیر جنگ (متوفی ۹ نومبر ۱۸۴۴ء) نے انھیں اپنی مصاحبت میں لے لیا۔ راحت نے خود اقرار کیا ہے کہ آشتہ کی لڑائی میں جو ۲۳ جولائی ۱۸۳۷ء کو نواب قدسیہ بیگم اور نواب جہانگیر محمد خاں کے درمیان ہوئی، راحت، نواب موصوف کی طرف سے شامل تھے[10]۔ دسمبر ۱۸۳۷ء میں نواب دولہ، بھوپال کے خود مختار

---

[1] گلستان سخن از قادر بخش صابر ص ۲۴۲۔ [2] سخن شعرا از نساخ ص ۱۷۵۔ [3] طور کلیم از سید نور الحسن ص ۴۴۔ [4] بزم سخن از سید علی حسن ص ۵۴۔ [5] گلستان سخن ص ۲۴۲۔ [6] حیات مومن از عرش گیاوی ص ۷۷۔ [7] گلستان سخن ص ۲۴۳۔ [8] گلستان سخن ص ۲۴۳۔ سخن شعرا ص ۱۷۵۔ طور کلیم ص ۴۴۔ بزم سخن ص ۵۵۔ [9] نتائج المعانی از محمود بیگ راحت حکایت نمبر ۱۲، ۲۵۔ (سکنر کی وفات ۱۸۴۱ء میں دہلی) [10] نتائج المعانی حکایت نمبر ۲۵۔ [11] نتائج المعانی حکایت نمبر ۱۰۔ [12] نتائج المعانی حکایت نمبر ۸۱۔ [13] نتائج المعانی حکایت نمبر ۸۶۔

والی ہوئے[1] - راحتؔ، سال جلوس سے لے کر وفات تک نواب کے ساتھ وابستہ رہے - نتائج المعانی میں تیرہ حکایتیں نواب دولہ کی زندگی کے مختلف واقعات سے متعلق ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ راحت کو نواب سے حد درجہ عقیدت اور نواب کو راحتؔ پر بے پناہ اعتماد تھا۔

بھوپال کی ریاست سے ان کا سلسلۂ ملازمت کس زمانے میں منقطع ہوا - اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا - لیکن گمان کہتا ہے کہ نواب جہانگیر محمد خاں کی وفات کے بعد راحتؔ واپس دہلی آ گئے تھے - اور بعض تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق علائق دنیوی سے دستبردار ہو کر انھوں نے خلوت نشینی اختیار کر لی تھی - یہ زمانہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۵۵ء کے درمیان شمار کیا جا سکتا ہے - صابر نے اپنے تذکرے میں جو ۱۸۵۵ء میں تصنیف ہوا، ان کے بارے میں لکھا ہے:

"مدت سے گوشۂ انزوا اختیار اور قطع علائق کو خلعت قد او تجویز کیا؛ آشنا و بیگانہ سے ترک ملاقات کر کے امید و بیم سے فارغ اوقات بسر کرتا ہے - سرمایہ علمی بہ قدر ضرورت فراہم ہے" ص۲۴۳

سری رام: (صاحب خمخانۂ جاوید) نے بھی اسی خیالات کا اظہار کیا ہے:

"غدر سے بیشتر فوجی ملازمت ترک کر کے خانہ نشین اور علائق سے دستبردار ہو گئے تھے" ص۳۰۲ - جلد سوم

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب نادر شاہی غارت گری کی طرح ایک بار پھر اہلِ دہلی پر عرصۂ حیات تنگ ہوا تو دوسرے بے روزگار لوگوں کی طرح راحتؔ بھی تلاشِ معاش میں ترک وطن پر مجبور ہوئے - اس دفعہ وہ دہلی سے ہجرت کر کے پٹیالے میں آ گئے - اس دور کی زندگی پر ان کی تصنیف مثنوی ہشت عدل، روشنی ڈالتی ہے - اس سے پتا چلتا ہے کہ راحتؔ، مہاراجہ نریندر سنگھ والی پٹیالہ (متوفی ۱۳ نومبر ۱۸۶۲ء) کے عہد میں پٹیالے میں آئے تھے - کیونکہ ہشت عدل میں ایک حکایت مہاراجہ نریندر سنگھ کے عدل پر بھی ہے - قیاساً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ راحت کو مہاراجہ موصوف سے قرب حاصل تھا - یہی وجہ ہے کہ ۱۸۶۲ء میں جب مہاراجہ نریندر سنگھ فوت ہوئے اور ان کی جگہ ان کے بیٹے مہاراجہ مہندر سنگھ مسند نشین ہوئے تو راحتؔ نے قصیدہ کہا - یہ قصیدہ مثنوی ہشت عدل کے ہمراہ چھپ چکا ہے[2]۔

پٹیالے میں قیام کا زمانہ راحتؔ کے لیے بے حد عسرت اور تنگ دستی کا دور تھا - اس زمانے میں اس نے تصنیف و تالیف شروع کی - پہلے تذکرہ خزینۂ راحت، پھر مثنوی ہشت عدل اور اس کے بعد نتائج المعانی لکھی - ہشت عدل مہاراجہ مہندر سنگھ کی خدمت میں پیش کی، اور انعام کے خواستگار ہوئے لیکن دلی مراد پوری نہ ہوئی[3] - نتائج المعانی

---

[1] تاج الاقبال تصنیف شاہجہاں بیگم دفتر اول ص۵۱ تا ص۴۲ - سیرت والاجاہی از سید محمد علی حسن ص۸ تا ص۱۲۱ - بھوپال ایڈیشن

[2] مطبوعہ مطبع نول کشور پٹیالہ ص۴۳

[3] دیکھیے نتائج المعانی، خاتمۂ کلام -

سر ولیم میور کی خدمت میں پیش کی گئی جس پر انھیں کچھ صلہ ملا[1]۔ یہ رقم کس قدر تھی، اس کی تفصیل دستیاب نہیں ہو سکی۔

راحت کی پریشاں حالی کا اندازہ مثنوی ہشت عدل کے مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی کیا جا سکتا۔ یہ اشعار انھوں نے مہاراجہ مہندر سنگھ کی نذر کئے تھے جو اس زمانے میں ریاست پٹیالہ کے حکمراں تھے[2]۔ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:
("یہ" کا اشارہ مہندر سنگھ کی طرف ہے)

تو ہے مریض اور یہ ہے مسیحا　　مشکل کیا ہے؟ تیرے مداوا
مانا ہم نے تو ہے پریشاں　　رنج ہے تیرے گھر میں مہماں
ہے یہ اشارہ تیرا کافی　　ہو جاوے گی اس کی تلافی

مہاراجہ مہندر سنگھ کو راحت نے اپنا ولی نعمت لکھا ہے[3]۔ پٹیالے میں مہاراجہ کے علاوہ ان کے مربیوں میں مہاراجہ کے وزیر اعظم سید محمد حسن خاں بھی تھے۔ ہشت عدل انھوں نے سید صاحب ہی کی وساطت سے ہی مہاراجہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اور صلے کی خواستگاری بھی انھی کے وسیلے سے تھی[4]۔

راحت کی وفات کے بارے میں صحیح تاریخ کا تعین مشکل ہے۔ محترم کلب علی خاں فائق صاحب کا خیال ہے کہ "سنہ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) تالیف تذکرہ طور کلیم سے پہلے انتقال کر گئے تھے"[5] راحت کی وفات سے متعلق اس کے علاوہ کسی جگہ کوئی اشارہ نہیں ملتا[6]۔

---

[1] خاتمۃ الطبع میں مہتمم مطبع کے الفاظ ہیں "از لبکہ یہ کتاب نتائج المعانی منظور نظر نکتہ سنجان مرکز دائرہ ہنر پروری اور مطبوع طبع دقیقہ نجمان منازل بروج آسمان قدردانی ہو کر پس حصول صلہ ہمارے مطبع میں واسطے طبع کے آئی"

[2] مہندر سنگھ، نرندر سنگھ کے اکلوتے بیٹے، ۱۶ ستمبر ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ باپ کی وفات پر حکمراں نامزد ہوئے لیکن کلی اختیارات ۱۸۷۰ء میں حاصل کئے۔ اسی سال رئیس اعظم طبقہ اعلیٰ ستارۂ ہند کا خطاب ملا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے راجگان پنجاب از گرفن)

[3] خاتمہ کلام مثنوی ہشت عدل۔

[4] سید محمد حسن مہاراجہ نرندر سنگھ کے زمانے میں حاکم عدالت تھے۔ نرندر سنگھ کی وفات پر گورنمنٹ نے ایک حکمراں کونسل بنائی جو شہزادے کے بلوغ تک ریاست کی نگراں تھی۔ اس میں تین افراد رکن تھے۔ ۱۸۶۶ء تک ان میں سے دو آدمی فوت ہو چکے تھے چنانچہ اسی سال سید محمد حسن اور سردار فتح سنگھ کو اہل کاران متوفی کی جگہ کونسل کا رکن بنا دیا گیا۔ اس زمانے میں سید صاحب صدر عدالت عالیہ تھے۔ مہندر سنگھ نے انھیں وزیر اعظم مقرر کیا۔ (راجگان پنجاب از گرفن)

[5] "مومن، حیات اور کلام" از کلب علی خاں فائق رام پوری ص ۱۴۸

[6] مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے میری مرتب کردہ کتاب نتائج المعانی کا مقدمہ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء

راحت کی تصانیف میں تین کتابوں کا ذکر انھوں نے خود کیا ہے۔

۱۔ تذکرۂ خزینۂ راحت۔ سال تصنیف اور تاریخ طباعت وغیرہ معلوم نہ ہو سکی۔ اس کا حوالہ نتائج المعانی کے سبب تالیف میں موجود ہے۔

۲۔ مثنوی ہشت عدل۔ اس میں آٹھ مثنویاں مختلف بحروں میں اور ایک قصیدہ تہنیت مہاراجہ مہندر سنگھ شامل ہے۔ قصیدہ فارسی زبان میں ہے اور مثنویاں آٹھوں اردو میں ہیں۔ مثنویوں میں آٹھ مختلف عدالتوں کا ایک ایک واقعہ ہے۔ ان میں عدل ذو الجلال اور عدل رسالت کے بعد اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، اکبر شاہ ثانی، مہاراجہ نرندر سنگھ اور مہاراجہ مہندر سنگھ کے عدل شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۰۹ھ میں تصنیف ہوئی اور فروری ۱۸۷۳ء میں مطبع نول کشور پٹیالہ میں طبع ہوئی۔

۳۔ نتائج المعانی۔ ۷۰ کے قریب مختلف واقعات، حکایتوں اور لطیفوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام واقعات راحت کی اپنی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ راحت کے سوانح اور شخصیت پر یہ کتاب اہم ترین ماخذ ہے۔ ۱۸۷۵ء میں پہلی مرتبہ مطبع میڈیکل پریس آگرہ سے شائع ہوئی۔ اب اسے راقم الحروف نے مقدمے اور تعلیقات کے ساتھ مرتب کیا ہے اور مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے اس کی اشاعت ہوئی ہے۔

ان کے علاوہ راحت نے خود کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن میرے سامنے ان کی صرف دو کتابیں ہیں، ممکن ہے تذکرہ خزینہ راحت میں زیر موضوع واسوخت کا بھی ذکر ہو۔

واسوخت راحت کا حوالہ فدا علی عیش کے تذکرے شعلہ جوالہ، سری رام کے تذکرے خمخانۂ جاوید اور گارسین دتاسی کی "تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی" میں موجود ہے۔ اس کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں قطعی فیصلہ مشکل ہے البتہ اتنی بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جس زمانے میں یہ واسوخت تصنیف ہوا وہ راحت کے لئے سخت بے اطمینانی اور جذباتی انقباض کا دور تھا۔ اور ظاہر ہے یہ ۱۸۵۷ء کے بعد یعنی قیام پٹیالہ کا زمانہ ہی ہو سکتا ہے۔ گارسین دتاسی نے لکھا ہے:-

"(راحت) کی ایک مخمس ۱۸ بندوں کی، اودھ اخبار کے ۳۰ جون ۱۸۶۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی"[1]

---

[1] تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی (فرانسیسی زبان میں) ص۵۲۲

دتاسی نے راحت کا نام محمود بیگ کی بجائے محمد بیگ لکھا ہے، جو غلط ہے[1] - اسی طرح واسوخت کو جو مسدس کی ہیئت میں ہے، مخمس لکھا ہے - کیونکہ زیرِ تبصرہ واسوخت کے علاوہ راحت کی کوئی نظم مخمس کی صورت میں سوائے دتاسی کے کسی دوسری شہادت سے ہم تک نہیں پہنچی -

تذکرۂ شعلۂ جوالہ جس میں اس واسوخت کو پہلی مرتبہ مکمل متن کے ساتھ شائع کیا گیا ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء مطبع نول کشور سے شائع ہوا - فدا علی عیش لکھتے ہیں :

" راحت تخلص ہے مرزا محمود بیگ صاحب دہلوی کا - معلوم نہیں کہ شاگرد کس کے ہیں نہ اور حالات ان کے معلوم ہوئے - مگر اس واسوخت سے جو اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے، دریافت ہوتا ہے کہ کلام بہت متین ہے اور شاعر خوش گو اور سخن دان خوش فکر سے ہیں " [2]

ان دو حوالوں کی بنا پر گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ واسوخت ۱۸۶۹ء کے قریب تصنیف ہوا - سری رام نے ان کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے :

" ایک مثنوی موسوم بہ ہشت عدل اور ایک واسوخت علاوہ غزلیات کے ان سے یادگار ہیں "[3]

راحت کا زیرِ مطالعہ واسوخت کل ۶۰ بندوں پر مشتمل ہے - مسدس کی شکل میں ہے - ہر دو اشعار کے بعد ایک تیسرا شعر ٹیپ کا ہے - جو پہلے چار مصرعوں میں بیان کئے گئے مضمون کو تکمیلی صورت دیتا ہے - راحت کے ہاں استعاروں کی کثرت نہیں، بالکل سیدھا سادھا اور براہ راست طریق اظہار ہے - مضامین سلسلہ بہ سلسلہ آپس میں مربوط بھی ہو رہے ہیں اور خطِ مستقیم میں برابر آگے بھی بڑھ رہے ہیں - وہ اگر ٹھہرے ہیں تو اس مقام پر جہاں محبوب کا سراپا بیان کرنا مقصود ہے - اس جگہ تشبیہیں اس قدر فنکارانہ انداز سے استعمال ہوئی ہیں کہ سراپا کے تمام متعلقات میں ایک فطری ربط نظر آتا ہے - واسوخت کے چودھویں بند سے جو سراپا شروع ہوتا ہے - اس کے تمام متعلقات کو یک جا کیجئے - محبوب نقاشی کا نمونہ یا PAINTED DOLL معلوم ہوتا ہے - لیکن ان تمام تشبیہوں کی بیرونی شہادتیں موجود ہیں جو ہمارے حواسِ خمسہ مہیا کرتے ہیں -

اٹھائیسویں بند کے بعد ایک دوسرا سراپا ہے - اس سراپے کی تمام تشبیہیں خیالی اور غیر محسوس ہیں - گیسو، ابر ہیں، ماہ تاب ہے، چشم فسوں ساز ہے، مژگاں، خوں ریز ہیں وغیرہ وغیرہ - اس سراپا سے شخصیت کی بجائے کیفیت وجود میں آتی ہے - یہ

---

[1] دتاسی نے اردو کی ایک مثنوی " نل دمن " کو محمود بیگ راحت کی تصنیف بتایا ہے - حالانکہ یہ مثنوی بھگونت رائے راحت کی ہے جنھوں نے غنیمت کی مثنوی نیرنگِ عشق کا بھی اردو ترجمہ نگارستان راحت کے نام سے کیا تھا -

[2] شعلۂ جوالہ (مجموعۂ واسوخت) ص۱۳۸

[3] خمخانۂ جاوید جلد سوم ص۲۰۳

سراپا واسوخت کے نفسِ مضمون کے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ ایک گوشت پوست کے محبوب پر رعب ڈالنے کے لیے مافوق الفطرت محبوب کا امیج زیادہ کامیاب ثابت ہوسکتا ہے۔

واسوخت کی صنف کو جس تہذیب نے جنم دیا تھا اسی نے حرم سرا سے داشتہ کے مکان کو الگ کیا تھا۔ اور ادب کا مقدر دیکھیے کہ اس کے حصے میں حرم سرا کی بجائے داشتہ کا مکان آیا۔ پس واسوخت میں شاعر اپنی محبوبہ کو اسی طرح بے حجابانہ رونقِ بزم بنانا چاہتا ہے جس طرح لکھنؤ کا کوئی وضع دار نواب اپنی لاتعداد بیگمات کے باوجود خوبصورت داشتاؤں کا ایک جمگھٹا اپنے گرد رکھنا پسند کرتا ہے۔ واسوخت کی محبوبہ رنگا رنگ پھولوں کا ایک ایسا گلدستہ ہے جو آپ کی محفل کو سجا سکتا ہے/ آپ کے لیے ضیافتِ طبع کا سبب بن سکتا ہے لیکن آپ اس سے روحانی تعلق قائم نہیں کر سکتے۔ گویا وہ ایک ایسی گڑیا ہے جسے چوما جا سکتا ہے لیکن اس سے عشق نہیں کیا جا سکتا۔ راحت کے زیرِ نظر واسوخت میں اس محبوبہ کا بھرپور تصور ہمیں ملتا ہے۔

راحت کے اسلوب میں قوت اور بلند آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ پہلے چار مصرعے بیتریت کی طرح اٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں، ایک مصرعے میں کئی کئی اضافتیں اسے اوپر کی طرف لے جانے اور تاثر کو شدید کرنے میں مدد دیتی ہیں اور آخری دو لینی ٹیپ کے مصرعے کاٹ کی طرح نیچے آتے ہیں اور تاثر کو بڑی سرعت کے ساتھ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

واقفِ لذتِ تیرِ نگہِ یار نہ تھے — تشنۂ آب دم خنجر خوں خوار نہ تھے
آہ اس دردِ جدائی میں گرفتار نہ تھے — وہی کچھ دن تھے کہ الفت سے خبردار نہ تھے
ہنستے رہتے تھے سدا ہم گل خنداں کی طرح
روئی صورت نہ تھی یوں بلبل نالاں کی طرح

راحت کو حسن اور متعلقاتِ حسن کا بڑا شعور ہے۔ عشق اور تلازماتِ عشق کا علم بھی وسیع ہے اور یہ تمام صلاحیتیں واسوخت میں نمایاں ہیں۔

ان تمہیدی کلمات کے ساتھ میں آپ کی خدمت میں راحت کا واسوخت پیش کرتا ہوں۔ اسے خود ملاحظہ فرمایئے، میری گزارشات سے آپ کو اکثر مقامات پر اتفاق ہوگا۔

واسوخت راحت

ایک دن وہ تھا کہ الفت سے ہم آگاہ نہ تھے — عشق کی نام کو چلتے بھی کبھی راہ نہ تھے
ان ستم گاروں کو ہم جانتے بھی آہ نہ تھے — واقفِ رنج و الم بھی کبھی واللہ نہ تھے
غنچے کی طرح دل اس ذکر سے تنگ آتا تھا
پاسِ ناموس تھا کچھ عشق سے ننگ آتا تھا

واقف لذت تیر نگہ یار نہ تھے　　تشنۂ آب دم خنجر خوں خوار نہ تھے
آہ اس دردِ جدائی میں گرفتار نہ تھے　　وہی کچھ دن تھے کہ الفت سے خبردار نہ تھے

ہنستے رہتے تھے سدا ہم گل خنداں کی طرح
رونی صورت نہ تھی یوں بلبل نالاں کی طرح

کچھ عجب جوش پہ تھی فصل جوانی کی بہار　　چہچہے یاروں میں رہتے تھے سدا لیل و نہار
یا کہ دریا پہ ہیں یا کرتے ہیں سیر گلزار　　میرے کوچے کا صبا نے بھی نہ دیکھا تھا غبار

نکہتِ خندۂ گلہائے دہانِ احباب
گلشن عیش میں رکھتے تھے ہمیشہ شاداب

جانتے بھی نہ تھے کہتے ہیں کسے غمزہ و ناز　　یہ سمجھتے بھی نہ تھے کیا ہے ادا اور انداز
نالۂ نے کی بھی سنتے نہ تھے دل سے آواز　　پوچھتے پھرتے تھے ہم معنی لفظ دم ساز

قد موزوں کا تصور تو کہاں آتا تھا
مصرعہ موزوں بھی زباں سے نہ پڑھا جاتا تھا

سادہ رویوں سے یہ نفرت تھی کہ اللہ اللہ　　نیچی آنکھیں کیے بازار میں رہتے سر راہ
اپنی بھی وضع سے ہم آپ نہ تھے کچھ آگاہ　　آئینہ بھی نہ کبھی دیکھتے تھے بھر کے نگاہ

وضع دل کش کسے کہتے ہیں خبردار نہ تھے
تھے طرح دار یہ گویا کہ طرح دار نہ تھے

اب یہ حالت ہے پڑے رہتے ہیں دن رات اداس　　اُڑ گئے طائر وحشی کی طرح ہوش و حواس
جز غم و رنج نہیں آ کے پھٹکتا کوئی پاس　　مونس و محرم و غم خوار ہے اک عالم یاس

جائے سینے میں نہیں ہے کہ جہاں ہوئے نہ داغ
دل کی جا پہلو میں جلتا ہے مری ایک چراغ

وہی ہم ہیں کہ اٹھاتے تھے سدا لطف شباب　　نشۂ بادہ میں سونگھی نہ کبھی بوئے کباب
جلتے تھے کہیں چاہت میں بڑے رنج و عذاب　　یہ نہ واقف تھے کہ اس طرح سے ہو دیں گے خراب

اپنی مل جائے گی سب خاک میں یہ رعنائی
سارے غم خوار بتائیں گے ہمیں سودائی

وہ کہاں صحبت احباب کہاں سیر چمن　　دامن گل کی طرح ٹکڑے ہے سب پیراہن

پاؤں میں چاک گریباں ہے گلے میں دامن   بار سر بھی مجھے گویا ہے وبال گردن

گھبراتا ہے فزوں چہرے کی رنگت میری
تنکے چنتا ہوں ہے وحشت سے یہ صورت میری

یہ نہ سمجھا تھا کہ اس طرح سے ہوں گا بے تاب   دل لگی کرتے ہی چھٹ جائیں گی سارے احباب
عمر بھر تڑپیں گے اس طرح سے سمجھا ہی نہ خواب   طاقت و صبر و تحمل ہمیں دے دیں گے جواب

عمر کے دن نہیں کٹنے کے تہ تیغ ستم
موت بھی پاس مرے آئے گی کھا دے گی قسم

یہ خبر کب تھی کہ دل آپ پہ مائل ہوگا   خنجر ناز کا قاتل ترے بسمل ہوگا
تو ہی یوں کر کے تکاوٹ مرا قاتل ہوگا   ایسا خوں خوار تو اے حور شمائل ہوگا

نام لینے سے مرے یہ تجھے نفرت ہوگی
اس محبت پہ میاں ایسی عداوت ہوگی

یہ بھی تقدیر کی خوبی کہ مجھے الفت ہو   اس محبت پہ مری آپ کی یہ صورت ہو
گرمی صحبت اغیار کی یہ شہرت ہو   میلے ٹھیلے ہوں سدا اور سدا خلوت ہو

محرم راز سے غیر تمہارے ایسے
دشمن جان ہے آپ ہمارے ایسے

دل میں انصاف ذرا کیجئے اور کیجئے غور   ناز و انداز کا یہ کس نے بتایا تجھیں طور
اب سجیلے جو ہوئے چاہنے والے ہوئے اور   ہاں میاں جو یہ سکھاوے (ہو) وہی لائق جور

آہ ظالم تجھے اس طرح بنانا ہی نہ تھا
غمزہ و ناز و ادا تجھ کو سکھانا ہی نہ تھا

میری چاہت ہی کی خوبی سے ہوئی یہ شہرت   سینکڑوں دیکھنے آنے لگے تیری صورت
پھر تو ہر ایک کو تم سے لگی ہونے الفت   اور ہی ہو گئے تم مجھ کو تو یہ ہے حیرت

نہ محبت نہ مروت نہ ملاقات رہی
نہ وہ صحبت نہ وہ اقرار نہ وہ بات رہی

تیغ تھے ابروِ خمدار مگر تھے بے آب   جھوٹے موتی در دندان تھے ہی یہ نایاب
ہونٹ پتلے تھے مقرر نہ کہ جوں برگ گلاب   طبع چالاک تری ایسی تھی کب جوں سیماب

دے کے کاجل کبھی چھوڑا بھی تھا یوں دنبالہ
آہ اب ایسا تو آفت کا بنا پرکالہ

ردکش غنچہ دم خندہ کب ایسا تھا دہن غیرت عطر بہاری تھی کہاں بوئے بدن
کب لچکتی تھی کمر آپ کی جوں شاخ سمن کب ہر اک بات میں کہتے تھے تم اے رشک چمن

تیری جلوت کے بھٹے کب سینۂ اغیار پہ گل
نالہ کس دن تھا مرا رشک صفیر بلبل

ایسی پیچیدہ بھلا آپ کی کب تھی تقریر یوں جھلاتے تھے لکھوتا نہ مسی کی تحریر
کھینچ کے کب جاتی تھی ملکوں میں تمھاری تصویر حسن یوسف کو دیا کرتے تھے کب تم سے نظیر

چاہنے سے مرے مشہور ہوئے تم ایسے
ورنہ معشوق زمانے میں بہت تم جیسے

بیٹھ کر تہ میں نکلتے تھے بھلا سیر کو کب چاک پردہ سے کہاں جھانکا کیا کرتے تھے جب
تھا لگاوٹ کا ستم گار تجھے ایسا نہ ڈھب واہ چلتوں کو اشاروں پہ لگا دیتے ہو اب

حسن کو پردے میں سے جھانکا اٹھ گویا مارا
سسکی بھرتا ہی نہیں اب تو تمھارا مارا

آپ کی باتوں میں کب ایسی فسوں سازی تھی کون سے دن تری چشمک میں یہ غمازی تھی
قد بالا میں کہاں آپ کے طنّازی تھی یاد کب آپ کو اس طرح کی دم بازی تھی

غیرت کبک دری چال تمھاری کب تھی
آئینہ دیکھو یہی شکل تمھاری جب تھی

آنکھ مجلس میں اٹھاتے ہوئے شرماتے تھے میرے بن سیر بھی کرنے نہ کہیں جاتے تھے
آنکھ جھک جاتی تھی گو بات بھی فرماتے تھے غمزہ و ناز و ادا کچھ بھی تمھیں آتے تھے

اب ہمیں چٹکیوں میں آپ اڑا دیتے ہیں
گہ رلا دیتے ہیں اور گاہ ہنسا دیتے ہیں

بیٹھنا کب پس چلمن تمھیں یوں آتا تھا جھانکنا تاکنا اس طرح سے کب بھاتا تھا
ہوت غیر سے دل تیرا دھڑک جاتا تھا پہروں بندہ کبھی تجھے باتوں میں بہلاتا تھا

بانکے دل کے کب اس طرح اڑے رہتے تھے
دیکھتے جلوۂ دل کش تو کھڑے رہتے تھے

دیکھنے اور دکھانے کے ہوئے جب قابل
اور ہی اور تمھارے لگے ہونے مائل

میں اگر ایسا سمجھتا تو نہ ہوتا بسمل
نا سمجھ ورنہ دیتا کبھی ہرگز تمھیں دل

کبھی ایمان نہ لاتا نہ مسلماں ہوتا
آپ کا چہرہ اگر صورت قرآں ہوتا

ہم یہ سمجھے تھے یوں ہی رابطہ رہے گا باہم
ہوں گے فرمائشوں کے رسل رسائل پیہم

خاصداں آدمی لاوے گا تمھارا ہر دم
کنٹھے اور ٹوپیاں بنواؤ گے دے دے کے قسم

اپنے ہاتھوں میں نشانی مری تم رکھو گے
گنجفہ میں بھی مرے نام کا خم رکھو گے

میرے زانو ہی کا تکیہ رہے گا آٹھ پہر
لیٹتے بیٹھتے زانو کے تلے یا تہ سر

منہ مرا دیکھے بن اٹھو گے نہ ہنگام سحر
آئینہ جب کبھی دیکھیں گے تو باہم مل کر

خاصہ جب کھائیں گے صاحب کہ جب ہم کھائیں گے
ہم نہ کھائیں گے تو کھانے کی قسم کھائیں گے

میر کو جاؤ گے جب رکھ میں کہیں سیر کے سوا
بن مرے پاؤں کبھی رکھنے کے نہیں تم زنہار

ساتھ ہی لے کے چلو گے مجھے باصد تکرار
تم سے کتنی کب یہ توقع کہ مجھے سو سو بار

حکم ہووے گا کہ مت آ مرے گھر چل یاں سے
آ نکلنا دیکھو فرماؤ گے یہ درباں سے

ہم نشیں آپ کے اس طرح سے ہوئیں گے رقیب
پھول کر بیٹھیں گے بلبل کی طرح گل کے رقیب

ہم کو یہ سوں کبھی زیارت نہیں ہونے کی نصیب
جوش وحشت سے مری ہوگی شورش یہ عجیب

گھر سے نکلے گا ہر اک لے کے پتھر باہر
تم بھی گھبرا کے نکل آؤ گے اکثر باہر

آہ اس طرح سے نقرہ مجھے دیں گے دم باز
جو ٹہل جائیں گے اس طرح سے مجھ پر غماز

یوں بگڑ جائیں گے دو دن میں تمھارے انداز
خیر گر خیر رہے یوں ہی ترے محرم راز

یہ سمجھ رکھیو کہ در پر ترے تلوار چلے
کل چلے، آج چلے، جب ہوئی تکرار چلے

معاملہ اگر نہ کرے گا مرا کوئی بد خواہ .
اور نظر بھی نہیں آنے کا کوئی شام و پگاہ

آپ کبھی اور نہ چھوڑیں گے رقیبوں سے یہ راہ   خوب یہ دل میں سمجھ رکھیے ہے اللہ گواہ

شعلہ رو ڈھونڈھ کے ایسا میں کوئی یار کروں

پھر تصور کبھی نہ تیرا کبھی زنہار کروں

جانتے ہو کہ مرض یہ کبھی جانے کا نہیں   دل لگی بن کبھی آرام یہ پانے کا نہیں

دیکھ لینا کہ غم ہجر میں کھانے کا نہیں   آنکھ میں بھی کبھی آنسو مری آنے کا نہیں

ضد سے تیری کوئی وہ ماہ لقا لاؤں گا

ذکر بھولے سے بھی ہرگز نہ ترا لاؤں گا

ہوئے وہ رشک پری ماہ لقا غیرت حور   شعلہ طور کہے کوئی اُسے عالم نور

آنکھ اٹھا تیری طرف دیکھے اگر وہ مغرور   رنگ اُڑ جائے ترے چہرے کا جیسے کافور

ہوش اڑ جائیں ترے غش کی سی حالت ہووے

نفرت آنے لگے ہر اک کو یہ صورت ہووے

لمحۂ ناصیہ ہو گیسوؤں سے ایسا عیاں   نصف مہتاب نہ ابر ہو جس طرح نہاں

اور بھویں ایسی ہوں کافر کی جیسے کہ کماں   اصفہانی ہو کبھی یا کہیں تیغ براں

دیکھ کر اس کی بھویں بھول یہ چڑھانی بھولو

ایسی چھپکلیاں سی کاجل کی بنانی بھولو

ہوں فسوں ساز وہ کافر کی بلا چشم سیاہ   ایک چشمک سے ہوں سب ساحر بنگالہ تباہ

ہوئے وہ عابد صد سالہ فریب اس کی نگاہ   دیکھ کر مانگے فرشتہ بھی جسے دل میں پناہ

خوبخود اشک ندامت میں یہ ڈھیلے گھل جائیں

ہووے وہ آنکھ کہ جس سے تری آنکھیں کھل جائیں

ہو وہ خو کردۂ خونریزی عاشق مژگاں   جان عشاق ہو اس تیر مژہ کے قرباں

پنجۂ دست قضا اس کو کہیں اہل زباں   فتنہ حشر ہو ہر جنبش پنہاں سے عیاں

تو گر اس جنبش مژگاں پہ کرے ایک نگاہ

بیٹھ ہی جائے کلیجے کو پکڑ کر سر راہ

اور ہو بینی موزوں کا یہ اس کے نقشا   لوح قدرت پہ الف جیسے ہو قدرت سے کھچا

دیکھ اس کو نہ رہیں آپ کے پھر ہوش بجا   بے خودی میں یہی جی چاہے کہ کیجے سجدا

رکھ کے سر پاؤں پر اس شوخ کے ترسا ہو جائے
ناصیہ سائی سے پیشانی میں گھٹا ہو جائے

غنچۂ باغ عدم اس کی ہو تنگیٔ دہاں   لعل ہوں ہونٹ تو ہیرے کی کنی ہوں دنداں
ہو وے اس نکتۂ موہوم سے قدرت یہ عیاں   ایک بجلی سی چمک جائے اگر ہو خنداں

اس کے اوصاف دہن سن لے اگر کان سے تو
ہاتھ دھو بیٹھے اسی وقت مگر جان سے تو

رو کش عارض خورشید ہو عارض کی ضیا   خال کا نام سے لے تا بہ حبش ہو شہرا
چاہ غبغب کبھی گر دیکھ لے یوسف اس کا   عمر بھر چاہ محبت میں رہے اس کے پھنسا

سیب جنت سے فزوں سیب زقن ہو اس کا
شعلۂ طور جسے کہیے بدن ہو اس کا

اس کی گردن کی صراحی اگر آ جائے نظر   ہچکیاں لے لے کے رویا کرے تو شام و سحر
قبہ نور کہیں شانوں کو سب اہل بصر   دیکھتے ہی انہیں تو تھام لے ہاتھوں سے جگر

سینہ ابھرا ہوا وہ دیکھ کے حسرت ہووے
آپ ہی اپنے سے دل میں تجھے نفرت ہووے

کان ہوں اس مہ انور کے کہ جیسے گل تر   اور بنا گوش کے ہو نور پہ قربان سحر
بجلیاں پہنے ہوئے کانوں میں ہو وہ دلبر   اور جھبڑے بھی ہوں پڑے مونڈھوں سینے ڈھلکر

ہووے وہ زلف کہ دیکھے سے پریشان ہو تو
اپنی ان باتوں سے کہا کیا نہ پشیمان ہو تو

ساعد دست نگاریں کا ہو ایسا جوبن   ڈھالے بلور کی جیسے کہ کوئی شاخ سمن
پہنچیاں پہنچے پہ ہوں بازووں پر ہوں جوشن   پنجۂ مہر جلے دیکھ کے پنجے کی پھبن

دیکھ اس دست حنائی کو پسے دل تیرا
پنجہ تاخیر سنے پنجۂ سر محفل تیرا

چھاتیاں ابھری ہوئی اور وہ جوانی کی بہار   جس پہ بن دیکھے ہو نامحرموں کی جان نثار
ایسے پستاں ہوں ترنج شجر قامت یار   کھٹے ہو جائیں جسے دیکھ کے جنت کے انار

کچھ جھلکتے جو دوپٹے کی تو تہ سے دیکھے
چھاتی بھر آئے یہ حسرت کی نگہ سے دیکھے

وہ شکم آئینۂ قدرت یزدانی ہو　　سیم گوں چھوٹی سے اک تختۂ نورانی ہو
جو ہر ناف بھی وہ عرض درخشانی ہو　　چشم انجم کو جسے دیکھ کے حیرانی ہو
خواب میں دیکھ کر اس آئینۂ حیرت کو
پیٹ کرے میں چھپاؤ جو اگر غیرت ہو

پشت وہ چشمۂ حیواں سے دوبالا ہوئے　　صدقے مہتاب کا اس پشت پہ ہالا ہوئے
چوٹی اس پر ہو پڑے حسن نرالا ہوئے　　منہ میں من جیسے لیے کھیلتا کالا ہوئے
آپ گر دیکھیں وہ پشت اور وہ کھجوری چوٹی
عمر بھر پھر نہ گندھے سر کی یہ پوری چوٹی

وہ نزاکت ہو کمر میں کہ رگ گل ہو خجل　　کھائے لچکے جو ڈھلے دوش پہ سر سے آنچل
دونوں جانب ہوں پڑے زلف گرہ گیر کے بل　　جس کی خوبی سے دل سنبل تر ہو بیکل
اس نزاکت پہ اگر اس کی اکڑ دیکھیے تو
دونوں ہاتھوں سے کمر اپنی پکڑ لیجے تو

گول گول اس کے سرین اور وہ بلوری راں　　آدے دیکھے سے تن عاشق بے جان میں جاں
پنڈلیاں دیکھ کے پھڑک جائے وہ کیونکر انساں　　شمع حسن ہوں پروانہ ہوں جس کی پریاں (کذا)
پاؤں اس گل کے ان ہاتھوں سے دباؤں کیا کیا
شعر و شعلۂ نمط تجھ کو جلاؤں کیا کیا

نرم نرم اس کے کف پا ہوں وہ رشک مہتاب　　فرش قاقم پہ رکھے پاؤں تو ہووے بیتاب
ناخن پا مہ نو دیکھ کے ہو رو بہ نقاب　　پاؤں جب رکھے زمیں پر جو بچھے برگ گلاب
دیکھ کر وہ کف پا آپ کو گر غیرت ہو
لے کے دیکھو نہ کبھی آئینہ پھر صورت کو

ہوئے اس قامت دل کش پہ قیامت صدقے　　سرو جنت بھی اسے دیکھ کے غش کھا کے گرے
پائنچے سنجاف کے ٹھمکی میں وہ جس وقت چلے　　ہو کے بیہوش اگریں پریوں کے گرہ ہو کے پڑے
یہ ہو اس زہرہ جبیں ماہ لقا پر جوبن
صدقے جوتے کے ستاروں پہ ہو سورج کی کرن

جاں فزا ہو دم رفتار صدائے خلخال　　وضع مستانہ ہو اور اس پہ ہو اک نازکی چال

پاؤں وہ ناز سے جس جا پہ رکھے بدر کمال   خاک اس جاے کی لے جائے پری آنکھ میں ڈال
اتفاقاً کہیں وہ نقش قدم دیکھو تم
آئینہ پھر نہ کبھی تا بہ عدم دیکھو تم

ہو وہ تقریر کہ دیکھا کرو چہرہ اس کا   سامنے اس کے نہ جائے کبھی تم سے بولا
سینکڑوں پھبتیاں تم پر کہے وہ نام خدا   دیکھ کھسیانا تمھیں کیا ہی ہمیں آئے مزا
چھیڑے ایسا تمھیں ہنس ہنس کے کہ رونے لگ جاؤ
آؤ غیرت پہ تو پھر جان کو کھونے لگ جاؤ

غمزہ و ناز و کرشمہ و ادا میں انداز   موقع موقع سے ہو ہر عضو بدن کے انداز
چشم ہو نرگس جادو لب میگون اعجاز   ہووے دلچسپ مزا میرسے افزوں آواز
اس کی آواز خوش آہنگ سناؤں تجھ کو
ہو کے سرگرم سخن اس سے جلاؤں تجھ کو

میلے ٹھیلے ہوں سدا اور سدا ہووے بہار   رتھ میں وہ بیٹھے ہوں اور گھوڑے پہ ہم ہوئیں سوار
جاک پردے سے ہمیں جھانکنے جاویں ہر بار   ہوں اشاروں میں وہ باتیں کہ نہ سمجھیں اغیار
دیکھ یہ ربط بہم سینہ ترا چھن جاوے
جی یہ چاہے کہ کسی طرح سے یہ من جاوے

مجھ میں اور اس میں یہ کچھ ربط وفا ہو باہم   وہ مرے نام کا عاشق ہو ملیں اس کا ہم دم
رنجش تفرقہ پرواز نہ اغیار کا غم   ہو گئیں سرشار مئے ناب محبت میں بہم
اس کو لپٹا کے گلے لطف اٹھاؤں کیا کیا
کوفت جو دل نے اٹھائی ہے مٹاؤں کیا کیا

باغ میں ساتھ کبھی اپنے اسے لے جاؤں   نغمۂ بلبل و طوطی میں اسے سنواؤں
فرش گل کر کے خیاباں میں اسے بٹھلاؤں   لب جو بادۂ گل رنگ اسے پلواؤں
باہم ایسا ئے دو آتشہ کا دور چلے
گھر میں تو آتش اندوہ میں گھٹ گھٹ کے جلے

بزم احباب میں جاؤں جو بتقریب کہیں   آدمی ساتھ نہ ہو ان کا یہ ممکن ہی نہیں
خاصداں پانوں کا پھر دوسرے پہنچے نہ ہیں   دو گھڑی میں یہ پیام آئے رہو شب کو وہیں

روٹھ جاویں جو لگے دیر مجھے محفل میں
منتیں کر کے مناؤں انھیں اک مشکل میں

جی میں آتا ہے کہ ملنے سے قسم کھاؤں ترے　　ہووے بت خانہ جیں تو بھی نہ گھر آؤں ترے
سوتے میں بھی نہ کروں گھر کی طرف پاؤں ترے　　ہے یہی شرط اسے منہ سے ابھی لاؤں ترے

دم پھڑک جائے گا واللہ جو وہ آئیں گے
منہ چھپا لوگے جو شکل اپنی وہ دکھلائیں گے

میں نے پھر عہد وفا جس سے کیا اس سے کیا　　مجھ سا عاشق نہیں ملنے کا نہیں ملنے کا
ہے یہی وقت جو کچھ ہوگا ابھی ہوئیگا　　دی دغا تو نے مجھے پھر نہ یہ فرمائیے گا

ابھی لے آتا ہوں اس ماہ لقا کو جا کر
کل دکھاؤں گا جو فرماؤ گے تو یاں لاکر

کچھ نہیں اب بھی گیا مان تو میرا کہنا　　بند کر دیجیے اغیاروں کا گھر میں آنا
وہ ہی ہم ہیں وہی تم اور وہی رہنا سہنا　　گر نہ مانوگے تو تم دل میں سمجھ یہ لینا

خود بخود دیکھ کے خجل نامہ و پیغام کرد
جس میں ہو رفع تنازع وہی انجام کرد

چاہیئے آدمی ہر روز تمھارے آویں　　نت نیا صلح کا پیغام زبانی لاویں
میں ملوں یا نہ ملوں گھر میں وہ کہہ کہہ جاویں　　میری جانب سے جواب آپ نہ جب کچھ پاویں

حکم گھبرا کے یہ دو میری سواری لاؤ
بن بلائے مرے تم آپ سے دوڑے آؤ

شہر میں چرچے محبت کے مری گھر گھر ہوں　　آپ مشہور جفا کار ستم پرور ہوں
دوست جو آج ہیں دشمن سے بھی کل بدتر ہوں　　آپ سے آپ یہ اغیار رفو چکر ہوں

نہ تو ہم ہوں نہ یہ اغیار نہ جوبن ہووے
نہ یہ انداز نہ جلوہ پس چلمن ہووے

حسن دو روزہ پہ اتنا نہ کرو دل میں غرور　　اک نرالے تمھیں دنیا میں نہیں غیرت حور
شہر میں سینکڑوں معشوق ہیں تیشم بد دور　　خاتمہ ہو چکا حجت کا بس اب ہوں مجبور

آپ کے سر کی قسم خوب ہی پچھتاؤ گے تم
دیکھ لینا کہ یہ ساعت نہیں پھر پاؤ گے تم

بسکہ ہوں اہل وفا اور اٹھائے ہیں ستم دل لگی کرنے سے آیا ہے مرا ناک میں دم
تجھ سوا اور سے چاہت کی کبھی کھاتا ہوں قسم مجھ سا مشتاق بھی ملے گا کوئی اس وقت میں کم

کوئی مضمون نیا ڈھونڈ کے ایسا لاؤں
بن بلائے تجھے گھر بیٹھے بلا لے جاؤں

ہے یہی تم کو مناسب کہ ابھی مل جاؤ بھیج دوں تم کو سواری جو اگر فرماؤ
رنج بے جا کی شکایت نہ زباں پر لاؤ جس طرح آتے تھے گھر اپنا سمجھ کر آؤ

متہرؔ شہر دوبارہ مری چاہت ہووے
وہی تم ہو وہی گھر ہو وہی راحت ہووے

مخطوطات انجمن ترقی اردو

(فارسی۔عربی)

انجمن میں فارسی اور عربی مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے ان مخطوطات کی اجمالی فہرست سید سرفراز رضوی، مہتمم کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اردو نے مرتب کی ہے جس میں ہر مخطوطے کے بارے میں ضروری اور بنیادی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ متعدد مخطوطات کے عکس بھی شائع کئے گئے ہیں۔ طباعت بذریعہ آفسٹ

قیمت: تین روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ

کراچی ۱

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

نیاز احمد ہوشؔ اور ان کا کلام

آپ نواب حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے شجرۂ نسب یہ ہے۔ نیاز احمد خاں ابن نیاز محمد خاں ابن یار محمد خاں ابن محمد یار خاں ابن نواب حافظ رحمت خاں۔ آپ ایک جامع العلوم انسان تھے۔ کلیات ہوشؔ کے مقدمہ نگار نے لکھا ہے۔

"فن شاعری میں طاق، علم حکمت میں شہرۂ آفاق، علم ہیئت و ہندسہ میں مشہور۔ ہر ذی شعور ان کی ذہانت اور طباعی کا مائل، ہر اہل کمال ان کے کمال بے زوال پر مائل۔ غرض کہ کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں جناب کو دست قدرت نہ تھی۔ کوئی ایسا علم نہ تھا جس میں تمام وکمال واقفیت نہ تھی۔ بہت سے شاگرد ان کے صاحب دیوان ہیں۔"

آپ نے فارسی زبان و ادب کی تحصیل امیرالدین آزاد بریلوی سے کی۔ دیگر کتب درسیہ مختلف علما سے پڑھیں۔ فن طب حکیم مولوی محمد ابراہیم لکھنوی سے حاصل کیا۔ شاعری سے دلچسپی کم عمری سے تھی۔ اس وقت مقامی اساتذہ میں امیرالدین آزاد اور محسن علی خاں جوشؔ کا شہرہ تھا۔ لہٰذا ابتدا آپ نے ان اساتذہ سے اکتساب فیض کیا۔ آپ جب لکھنؤ تشریف لے گئے تو مظفر علی خاں اسیرؔ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامی ایام میں بریلی پر بھی مصائب کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔ مسلسل تین دن لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ نیاز احمد خاں ہوشؔ بھی ان حالات سے متاثر ہوئے اور بریلی کے باہر قدم نکالا۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں گھومتے رہے حیدرآباد بھی پہنچے۔ وہاں انھوں نے چار یادگار قصائد لکھے جو نواب آصف جاہ میر محبوب علی خاں والی حیدرآباد دکن، نواب میر لائق علی خاں بہادر مدارالمہام سرکار حیدرآباد، نواب محمد مظہرالدین خاں رفعت جنگ، وزیر و مدارالمہام سرکار دکن اور جناب سید علی صاحب شوستری اخوند و حضور رس دربار آصفی حیدرآباد کی مدح میں تھے۔ بریلی کی ادبی تاریخ میں یہ قصائد خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

نیاز احمد خاں ہوشؔ کی ان تصنیفات کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) تاریخ روہیلکھنڈ - یہ کتاب روہیلوں کی ہندوستان میں آمد اور ان کے مختصر دور حکومت پر مستند دستاویز ہے۔ طبع ہو چکی

ہے۔ اب کمیاب ہے۔

(۲) مثنوی ترانۂ ہوش - یہ کتاب بھی طبع ہو چکی ہے مگر نایاب ہے۔

(۳) حدیقۂ نعت - ایضاً

(۴) کلیات ہوش - یہ ہوش کا مجموعہ کلام ہے - یہ کتاب ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں مطبع گلشن فیض لکھنؤ میں طبع ہو کر اشاعت پذیر ہوئی - مرتب نواب نثار احمد خاں ہیں جو روہیلہ خاندان کے ادب نواز بزرگ تھے اور ہوش کے خلف اکبر -

(۵) شہادت نامہ بے نظیر
(۶) فسانۂ غرائب
(۷) واسوخت ہوش

} یہ کتب زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں - اب نایاب ہیں -

نیاز احمد خاں ہوش کے اہتمام سے ایک رسالہ گلدستہ ہوش افزا بھی نکلتا تھا - اس کی طباعت مطبع نظامی کانپور میں ہوتی تھی - اس کا بھی کوئی نسخہ فراہم نہیں ہو سکا -

کلیات ہوش فارسی و اردو غزلیات، اردو قصائد، خمسجات اور نعت و منقبت پر مشتمل ہے - قطعات تاریخ اور چند صفحات نثر کے بھی ملتے ہیں -

نیاز احمد خاں ہوش کئی خصوصیات کے حامل شاعر ہیں جن کی وجہ سے بریلی کی ادبی تاریخ میں انھیں ممتاز جگہ ملتی ہے - وہ قصیدہ نگار ہیں - بریلی میں قصیدہ نگاری خال خال ملتی ہے - جب تک بریلی میں نوابی قائم رہی، بیرونجات کے شعرا کا مجمع رہا اور وہ درباروں میں قصیدے پڑھتے رہے - جب نوابی ختم ہو گئی اور مقامی امرا اور شعرائے بیرونجات نے وطن عزیز کو خیرباد کہا تو شاعری کو کچھ وقت کے لیے دھکا لگا اور قصیدہ نگاری کا تو ماحول ہی ختم ہو گیا - قصیدہ نوابوں اور امرا کے درباروں اور ڈیوڑھیوں سے وابستہ ہے - اس کا مقصد تو دربار میں باریابی اور سرکاروں میں قدم جمانا رہا ہے - بریلی میں نہ دربار رہا اور نہ درباری - قصیدہ نویسی معدوم سی ہو گئی - ہوش خود صاحب دربار تھے مگر زمانے کی گردش نے انھیں دوسروں کی مدح سرائی پر مجبور کیا - انھوں نے چار قصائد حیدر آباد میں لکھے جن کا میں ذکر کر آیا ہوں - تین قصائد مزید ملتے ہیں - ایک نعت رسولؐ میں - دوم منقبت علی کرم اللہ وجہہ میں - سوم مدحت سبط رسول حضرت امام حسین شہید کربلا میں -

ہوش کے قصائد میں تازگی اور خوش فضائی کا ماحول ملتا ہے - ان کے قصائد رفعت تخیل اور پرشکوہ مضامین و الفاظ سے مزین ہونے کے باوجود گھٹن، کیف ناہیت اور گرانباری سے محفوظ ہیں - زبان میں لطف اور ادائیگی میں روانی ہے - مندرجہ ذیل اشعار محبوب علی خاں والی دکن کی مدح کا مطلع ثانی ہیں -

اس کے گیسو ہیں کہ دامان سحاب رحمت   اس کے ابرو ہیں کہ محراب حریم طاعت

سلسلہ ہمسریٔ زلف کا ہو جائے دراز — کاکلِ حور کی آنے کو اگر ہو شامت
جبۂ صاف نہیں نصفِ مہِ چاردہ سے — جس سے اک نکتہ کی روشن ہوئی کل پہ ہیئت
یعنی جو سات کواکب ہیں فلک پر ممتاز — زیرِ حکم اس کے رہا کرتے ہیں وہ ہر ساعت
قابِ قوسین کی تفسیر ہیں دونوں ابرو — خطِ قوسی مہِ نو کو کریں ادنیٰ ہے صفت
روبرو ان کے گھٹے کیوں نہ ہلالِ گردوں — اوج پر جو رہیں معراجِ نبی کی صورت
کان وہ کان جواہر ہیں کہ دیکھے نہ سنے — جن کی امکانِ بشر سے کہیں خارج ہے صفت
اس کی آنکھیں ہیں کہ دو ساغرِ صہبائے نشاط — دیکھ لے جم تو اٹھے جشن میں کیا کیفیت
پردۂ چشم کے ہونے میں یہی پردہ سب ہے — کہ یہ مردم نظرِ بد سے بچیں ہو شہرت
خال سے آنکھ کا کس طرح نہ ہو حسن ہزار — عین نقطے سے کہے عین کی پیدا صورت
ڈال دے عینِ عنایت کی نظر وہ جس پر — گردشِ چشمِ فلک سے ہوا سے کیا دہشت
رخ پہ اس وجہ سے بینی ہے الف کی مانند — تا ہو قرآں سے یکتائی کی پیدا حجت
سامنے اس کے گلِ مہر نکالے کیا رنگ — نسرِ طائر بھی فدا جس پہ ہو بلبل کی صفت
سبزۂ خط کا کب آغاز ہے رخساروں پر — چاندنی کا یہ ہرا کھیت ہوا بے محنت
متصلِ رخ کے نہ کس طرح ذقن ہو اس کا — چاہ کو ہوتی ہے گلزار سے اکثر قربت
لبِ جاں بخش کی جنبش سے یہ پیدا ہے صدا — اے مسیحائے فلک یہ ہیں شفا کی آیت
آبِ ذناب دُرِ دنداں سے ہوا یہ روشن — کہ یہ خورشیدِ صباحت کا ہے نجمِ قسمت
دیکھ لے چشمۂ حیواں جو دہن کو اس کے — وہیں گڑ جائے زمیں میں ہو یہ حاصل خجلت
پائیں جب ایک جگہ جمع حیات اور عدم — منطقی کیوں نہ ہوں پھر قائلِ تیرِ قدرت
سامنے اس کے بنے مصریوں سے لیک نبات — کہیں گھبرا کے خجالت کے عرق کو شربت
کہتی ہے اہلِ تماشا سے زبانِ شیریں — بھرے دم سے کلام نمکیں کی لذت
گو نئی بات ہے شکر سے نمک ہے پیدا — پر نسبت یہی میں ہو کس طرح کلام و حجت
شالِ کشمیر کے دو پھول ہیں نعلیں اس کی — خلد کا نور ہوا دیکھ کے جن کی نزہت
سیمِ خالص سے بھرے جب رہیں بازو اس کے — کیوں نہ ہو قوتِ بازو سے متونِ دولت
دم میں تاروں کے خزانے کو لٹا دیں وہ ہاتھ — طے کریں صورتِ حاتم وہ سخا کی ساحت
انگلیاں پنجۂ خورہی کو نہیں پھیرتی ہیں — مانگتا انساں سے یہ پنجۂ مرجاں بھی دیت

ناخن تیغ ہلال اس کا ہر اک ناخن ہے — دیکھ لے جو اسے ہو عید کی حاصل فرحت
سینۂ صاف ہے گنجینۂ اسرار خدا — اس کے بندے ہوں نہ کیوں صوفی صافی طینت
پشت وہ تختہ سیمیں ہے ازل سے اب تک — صاف ہے دہر میں جو پشت پناہ خلقت
موج دریائے بہار اس کا شکم حبب بحر ہے — ناف پھر غنچہ گرداب نہ ہو کس صورت
ساق گردوں پہ رکھے فوق جو رہتے ہیں وہ ساق — پھر جو ہو مہر فلک نقش قدم کیا حیرت
خلد تک اس قد موزوں کی اگر بو پہنچے — تو ادب سایۂ طوبیٰ سے کہے قد قامت

ہوش کے قصائد اردو ادب میں اضافہ ہیں۔

نیاز احمد خاں ہوش کی غزل بھی بریلی کی ادبی تاریخ میں منفرد حیثیت کی مالک ہے۔ اردو غزل گوئی کا وہ طرز جس کے سودا بانی تھے اور جو ان کے سلسلے کے شعراء کے ذریعے بریلی میں مروج نہیں ہو سکا تھا، ان کے سلسلۂ تلامذہ کی بریلی میں آخری کڑی نیاز احمد خاں ہوش کے ذریعے اشاعت پذیر ہوا اور ان پر ہی ختم ہو گیا۔ ہوش کی زبان منجھی منجھائی رواں دواں ہے ورنہ یہ باور کرنا مشکل ہوتا کہ یہ کلام ہوش ہے یا کلام سودا۔ انھوں نے سودا کی طرح، ایک قصیدہ نگار کے دماغ سے، پر شکوہ اور پر امید اور شگفتہ غزلیں لکھی ہیں جو بریلی کی تاریخ غزل گوئی میں کسی بھی شاعر نے نہیں لکھیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سودا کی غزل گوئی کا آخری سرا ہوش کے ہاتھ میں ہے۔

ہر گیسوئے سیاہ صنم تاب دادہ تھا — بالائے سر نہ مانگ تھی پر لوز جادہ تھا
کیا گرم عیش غیر سے وہ شعلہ خو رہا — کیوں آج سوز اپنے جگر میں زیادہ تھا
دیکھا تو خانقاہ سے کم تھا نہ میکدہ — صرف سجود پیشہ سر جام بادہ تھا
گل سارے آب آب تھے اس رخ کے سامنے — رنگ چمن حباب سے ہم رنگ بادہ تھا

مرنے کے بعد ہوش یہ رتبہ مرا بھرا
میں تھا سوار ساتھ زمانہ پیادہ تھا

دل ناداں نہیں رخ پر جو مچلی جاؤں گا — نقش پا ہوں کبھی کوچے سے نہ ٹل جاؤں گا
وہ بلائیں لگے تو کیوں سر کے نہ بل جاؤں گا — دیکھیے دم تیغ کو مقتل سے نکل جاؤں گا
تیرے دامن کو میں کیوں چھوڑ کے ٹل جاؤں گا — کیا ہوں پیراہن کہنہ کہ نکل جاؤں گا
قطرۂ اشک ہوں دکھلایئے مجھ کو جلوہ — شجر طور نہیں ہوں جو میں جل جاؤں گا
ابھی اٹھ بیٹھوں گا آؤ تو عیادت کے لیے — مرض الموت بھی ہو گا تو سنبھل جاؤں گا
گرم کیوں ہوتے ہو محفل میں مجھے دیکھ کے تم — شمع ساں خود ہی سحر تک میں پگھل جاؤں گا

قصرِ مقصود کو ڈھا دیتی ہے اکثر عجلت — قولِ یوسف تھا نہ میں زیرِ محل جاؤں گا
دل ہے لبریزِ مئے عشق سے پیش داور — یہی شیشہ لیے میں زیرِ بغل جاؤں گا
پیکرِ سنگِ جفا سے جو وہ سمجھیں گے خلا — پھر تو میں رنگ کے مانند بدل جاؤں گا
ناتوانی نے بنایا ہے ہوا اے درباں — میں تو دیوار کے روزن سے نکل جاؤں گا
ہے سلامت جو مرا داغِ جگر کیا غم ہے — ساتھ مرقد میں لیے میں یہ کنول جاؤں گا
ہے خطا زلفِ سیہ فام کی مدحت کرنا — کہاں سودا ہیں کدھر لے کے غزل جاؤں گا

باغ کیوں سبز دکھاتے ہو مرا ہوش ہے نام
کچھ میں نادان نہیں ہوں جو بہل جاؤں گا

مندرجہ ذیل غزلوں میں خارجیت کی اتفاقی اسیری بھی ملتی ہے جو بالیقیں عصری حالات، داد خواہی یا زورِ بیان کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

وصفِ کمر کیا تو یہ بول اٹھے موشگاف — ہم مانتے ہیں اس سخن لاجواب کو
لے ناتواں کی جان پیازی دوپٹہ جب — کافی نکیوں کفن کو ہو چھلکا پیاز کا
ہنسے گا باغ میں گل یوں جو بلبل — گرہ کھل جائے گی بندِ قبا کی

بزرگ شاعروں کی حیات میں ایک ایسا دورِ شاعری ضرور آتا ہے جب کہ ان کی شاعری کھنچ کر تلوار بن جاتی ہے۔ اس وقت وہ تقلیدِ غیر اور تشخص خولیش کے خول سے نکل کر ایک نئے وجود کو جنم دیتے ہیں جو دراصل ان کا اپنا ہی وجود ہوتا ہے اس وجود کا نور ان کے فن کا حاصل ہوتا ہے۔ اس نور سے ہی آنے والی نسلیں ان کے فن کو پہچانتی ہیں۔ یہ فن ادب کی تاریخ میں ایک مستقل علامت بن جاتا ہے۔ نیاز احمد خاں ہوش نے بھی ایک وجود کو جنم دیا تھا جس کے نور سے ان کی غزل با معنی حاصل، خوش انجام نتیجہ اور حلاوت آمیز انعام بنی۔ یہ وہ کلام ہے جو بریلی کی تاریخ غزل گوئی میں ایک علامت بنا اور جس کے وہ خاتم ٹھہرے۔

ہم چاہتے ہیں اے خمِ گردوں شراب کو — لیں داغ دے کے بھی نہ ترے آفتاب کو
یہ لطف ہے عجیب کہ رکھتا ہے وہ عزیز — شوخی سمجھ کے اپنے مرے اضطراب کو
ثابت ہوا عروج کی ہستی ہے آپ پر — دیکھا جو سربلند جہاں میں حباب کو
پھونکا ہے سوزِ ہجر نے اس ترکِ مست کے — اب صید کیوں کروں نہ میں مرغِ کباب کو
لیتا ہوں میں جو بوسے تو کرتے ہو کیوں شمار — جو دوست ہو تو دل میں رکھو تم حساب کو
آتی نظر ہے جلوۂ بت میں خدا کی شان — پاتے ہیں ہم عذاب میں پنہاں ثواب کو

نفرت ہمیں ہو اور وہ بت چاہے اے فلک — اللہ ہے جو دیکھ لیں اس انقلاب کو

چلنے میں جب وہ دو پہرے ہوکے آئی یہ صدا — نخوت نے لو ہلال کیا آفتاب کو

دیکھو سرزمیں نہ عیاں مہر حشر ہو — چہرے سے اپنے تم نہ اٹھاؤ نقاب کو

وصف کمر کیا تو یہ بول اٹھے موشگاف — ہم مانتے ہیں اس سخن لاجواب کو

سرمہ بناؤں دیدۂ دل کے لیے نہ کیوں
پاؤں جو ہوش خاک درِ بوتراب کو

پہنچیں گے حشر کے دن دولت دیدار کو ہم — کہتے ہیں مہر قیامت ترے رخسار کو ہم

زار ہیں تار نظر بن کے نکل جائیں گے — در سمجھتے ہیں ترے روزن دیوار کو ہم

خواب میں دیکھ لیا رات اسے اب اے چشم — عمر بھر دیں گے دعا طالع بیدار کو ہم

دشت میں آبلۂ پا سے نہیں خون رواں — خلعت سرخ پنھاتے ہیں ہر اک خار کو ہم

اے فلک رکھتے تھے یا سر پہ ہمیشہ دستار — یا جنوں میں ہوئے محتاج اب اک تار کو ہم

ہے تصور جو ترے چاند سے رخساروں کا — کہتے ہیں اس سے شب ماہ شب تار کو ہم

دیکھنا ایک دن اے ہوش کہ اس رونے سے
کرۂ آب کریں گے کرۂ نار کو ہم

نیاز احمد خاں ہوش ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۳۰ جون ۱۸۹۲ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ خاندان روہیلہ کے وہ آخری سربرآوردہ شاعر تھے۔ ان پر خاندان روہیلہ کی تقریباً ڈیڑھ صدی کی ادبی خدمت کا خاتمہ ہوتا ہے۔

فن شاعری (بوطیقا)
تصنیف: ارسطو۔ ترجمہ عزیز احمد

ارسطو کے مشہور رسالے "بوطیقا" کا مستند ترجمہ مع حواشی۔ شروع میں مترجم نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں ارسطو کے نظریۂ شاعری پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ قیمت: دو روپے پچاس پیسے

مقالات حالی (اول)
مولانا الطاف حسین حالی۔

مولانا الطاف حسین حالی مرحوم کے علمی، ادبی اور دینی مضامین جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے تھے ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ قیمت: تین روپے

انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ،
کراچی نمبر ۱

ابوسلمان شاہجہانپوری

سرسید احمد خاں

مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں

(۱)

قدیم خیال کے علماء میں سرسید احمد خاں اور ان کے افکار و عقائد کو پسند نہیں کیا گیا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ علماء کا ایک گروہ انھیں دائرۂ اسلام سے خارج ہی سمجھتا رہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ایسے ہی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد خوش عقیدہ اور روایت پسند بزرگ تھے اور قدیم خیال کے علماء کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس ماحول میں سرسید سے عقیدت تو دور کی بات ہے، ان کے بارے میں کسی اچھی رائے کا گمان بھی نہیں کیا جانا چاہیئے تھا۔ ان حالات میں سرسید کی کتابوں کے مطالعے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اردو زبان و ادب کے کسی شیدائی کے لیے سرسید کو نظرانداز کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ان کے بعض مذہبی خیالات سے متاثر نہ ہو لیکن اردو زبان و ادب کے بارے میں ان کی خدمات کا اعتراف کیے بغیر ہرگز چارہ نہیں۔

ٹھیک یہی صورت مولانا ابوالکلام آزاد کے سامنے پیش آئی۔ مولانا کو اردو زبان و ادب کا شوق ہوا اور اردو مصنفین کی کتب کے مطالعے کی طرف توجہ ہوئی تو سرسید کی بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی نظر سے گزریں۔ ان سے ان کی دیگر تصنیفات کا شوق ہوا اور بقول مولانا آزاد:-

"اس طرح میری زندگی کے ایک بہت بڑے فکری تغیر کی بنیاد پڑی"

مولانا نے رفتہ رفتہ سرسید کی تمام تصنیفات، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار اور تہذیب الاخلاق

نوٹ:- اس مضمون کے ابتدائی حصے کے تمام مطالب و اقتباسات "مولانا آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" بہ روایت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے ماخوذ ہیں اور مضمون کے حصہ ثانی کی تیاری میں مولانا آزاد کے خطبہ تقسیم اسناد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲۰ فروری ۱۹۴۹ء) سے مدد لی گئی ہے۔ اس لیے دونوں ماخذ کا بار بار تذکرہ اور حوالے دہرانا مناسب معلوم نہیں ہوا۔ (ابوسلمان)

کی تمام جلدیں منگوائیں - اور پھر اس شوق نے ارادت وعقیدت کی شکل اختیار کرلی - مولانا فرماتے ہیں:

" سرسید کی تصنیفات کا شوق بتدریج اس طرح دل و دماغ پر چھا گیا کہ اب کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے سامنے آنکھوں میں نہیں جچتی تھی - شوق نے ارادت وعقیدت کی شکل اختیار کرلی اور یہ ہوا کہ ایک عقیدت مند کی طرح جو اپنے شیخ و مرشد کے ملفوظات کے ایک ایک لفظ کو دل و جان دے کر خریدنا چاہے"- ان کی تصنیفات کا ہر صفحہ ' ہر ورق میں نے نہایت جد و جہد کر کے حاصل کیا - سرسید کی تصنیفات کا شوق نہیں بلکہ ان سے عشق ہو گیا تھا اور طبیعت کو اس تصور سے کبھی صدمہ ہوتا تھا کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ ہے اور وہ میرے پاس نہیں ہے "

اس زمانے میں سرسید کی کتابوں کے شوق اور مطالعے کی محویت کا یہ عالم تھا کہ رات کے دو دو تین تین بجے تک مولانا مطالعہ کرتے تھے - دن میں چونکہ درسیات کی مشغولیت اور کچھ والد صاحب کے خوف کی وجہ سے اس بات کا موقع نہ ملتا تھا کہ کسی غیر درسی کتاب کا مطالعہ کریں - ان کے والد مولانا خیر الدین اس بات کے سخت خلاف تھے کہ دوران تعلیم میں درسیات کے علاوہ تصنیف و تالیف کی مشغولیت اختیار کی جائے یا کسی اور کتاب کے مطالعے میں وقت صرف کیا جائے - خوف کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا کو سرسید کی کتابوں کے مطالعے کی اجازت ملنے' کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا - اس لیے رات کو جب سب گھر والے سونے کے لیے لیٹ جاتے تو مولانا آزاد تکیے کے نیچے سے سرسید کی کوئی کتاب نکالتے اور موم بتی جلا کر مطالعے میں مستغرق ہو جاتے - رمضان کا مہینہ تھا ، عشاء کے بعد مطالعہ شروع کرتے اور ڈھائی بجے جب ماما سحری کے لیے اٹھانے آتی تو ختم کرتے - اس زمانے کا ایک واقعہ مولانا نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ رات کا ایک بجا ہوگا ، موم بتی ٹمٹما رہی تھی اور مولانا تکیے پر دونوں کہنیاں رکھے مطالعے میں غرق تھے کہ ان کے والد سامنے صحن سے گزرے اور انھیں مطالعے میں منہمک دیکھ کر وہیں سے پکارا کہ رات کے وقت کیا دیکھ رہے ہو؟ کون سی کتاب ہے ؟ مولانا فرماتے ہیں کہ " مجھے اپنی یہ چالاکی اور حیلہ جوئی اب تک یاد ہے کہ میرے سرہانے مختصر المعانی بھی تھی ' فوراً کہہ دیا کہ مختصر المعانی "

انھی دنوں مولانا نے رحمت اللہ رعد کی جنتری میں " حیات جاوید " کی طباعت کے قریب الاختتام ہونے کا ذکر چھپا ہوا دیکھا تھا اور اس کے حصول کے لیے بے تاب ہو گئے تھے مولانا نے تفصیل کے ساتھ اپنی بے تابی اور اس کے حصول کی خوشی کا تذکرہ کیا ہے - ہزار ایک صفحہ کی کتاب تھی صرف دو راتوں میں پوری کتاب پڑھ ڈالی اور جب تک کتاب ختم نہیں ہو گئی چین نہیں پڑا ، شوقِ مطالعہ کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مولانا نے اس روز شام کا کھانا بھی اس خوف سے نہیں کھایا کہ اتنی دیر اس کے مطالعے سے محروم رہ جائیں گے -

سرسید کی کتابوں کے مطالعے سے مولانا کے افکار و عقائد میں بھی ایک طوفان اٹھ چکا تھا - مولانا کے الفاظ میں کہ " میری زندگی اب چل نہیں رہی تھی ' بہ رہی تھی ' تمام قدیم چیزیں حقیر و ذلیل ہو چکی تھیں .... اور ہر وہ چیز جو ان کی طرف

منسوب ہو میرے قلب و ذہن کے لیے بمنزلۂ معبود تھی ۔" اور ایک مقام پر سرسید سے تاثر اور انقلاب افکار و عقائد کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

"سرسید کی تصنیفات جب نظر سے گزریں تو بالکل ایک نئی دنیا نظر کے سامنے آ گئی ...... نئے عالم کی دل فریبیوں نے مسحور کر لیا اور جوں جوں آگے بڑھا یہ سحر بھی بڑھتا گیا ۔ حتیٰ کہ اب ایک مسمریزم کے معمول کی طرح میری دماغی فعالیت کا بالکل عامل کے قبضے میں تھی ۔ تقریباً چھ مہینے کے اندر میں نے سرسید کی تمام کتابیں دیکھ ڈالیں اور اچانک ایسا معلوم ہوا کہ ایک بے حد عجیب و مدہش اور بلند تر پرعظمت عالم میں آ گئے ہیں ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بالکل ایک مخمور دماغ کی سی حالت رہنے لگی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک عجیب و غریب خزانہ قبضے میں آ گیا ہے ۔ اس پر فخر تھا، غرور تھا اور اس کے سامنے فکر و عقائد کی پچھلی تمام باتیں ہیچ نظر آتی تھیں ۔ میں نے "ہیچ" کہا لیکن یہ بھی ابتدائی احساس تھا ۔ بعد کو یوں ہوا کہ حقارت کی جگہ ان کی ذلت کا احساس ہونے لگا ۔ اس خیال سے شرم محسوس ہوتی تھی کہ چھ مہینے پہلے میرے ایسے عقائد تھے اور تعجب ہوتا تھا کہ کیوں ایسے دقائق سے اب تک محروم رہا ۔ اب معاملہ تقلید و عدم تقلید، وہابیت و حنفیت سے گزر چکا تھا اور ایک ایسی بلندی پر اپنی جگہ محسوس ہوتی تھی، جہاں سے یہ تمام جماعتیں، یہ تمام عقائد و افکار اور یہ تمام جھگڑے بالکل حقیر دکھائی دیتے تھے ۔ خواہ حنفی ہوں، خواہ غیر مقلد، شیعہ ہوں یا سنی، ماتریدی ہوں یا اشعری" ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ کہ کوئی بھی اسلام کی اصلی حقیقت یا سرسید کی اصطلاح میں "ٹھیٹ اسلام" سے آشنا نہیں ۔ قرآن کے اصل حقائق و معارف اور مذہب کی اصل تعلیمات تو وہ ہیں جن کے چہرے پر سے تیرہ سو برس بعد اس مجدد اعظم (جیسا کہ میری اس وقت کی بول چال تھی یعنی سرسید) نے پردہ ہٹایا ہے ۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں :۔

"میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ اس زمانے کی دماغی سرشاری اور قلبی مخموری کی پوری تصویر کھینچ سکوں ۔ میں ایک بت کی طرح سرسید کی پوجا کرتا تھا ۔ ان کی عظمت میرے دل کے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی ۔ ان کا وجود میرے ذہن میں فضائل انسانی کا ایک مکمل نمونہ تھا، جس کی طرف ایک شائبۂ نقص بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ بارہا حسرت ہوتی تھی کہ "یا لیتنی کنت معہ" ! میں سوچا کرتا تھا کہ اگر اس وقت وہ موجود ہوتے تو میں کس طرح تمام علائق ترک کر کے ان کے پاس چلا جاتا اور کس طرح ان کی پرستش کرتا ۔"

سرسید کی تفسیر القرآن، تہذیب الاخلاق اور دیگر کتب و رسائل کی عبارتیں اور مباحث مولانا کو تقریباً حفظ ہو گئے تھے اور بحث و مباحثہ میں انھیں پیش کرتے تھے ۔ سرسید سے سب سے بڑی چیز جو مولانا کو ملی وہ "ترک تقلید" تھی ۔ مفسرین کی، فقہا کی، محدثین کی، متکلمین کی، علما کی غرض کہ تیرہ سو برس کے تمام اجماعی عقائد و مسلمات کی اب ان کی نظروں میں کوئی حیثیت نہ

تھی۔ بعد میں مولانا کو خود اس بات پر حیرت تھی، تعجب تھا کہ وہ خود سرسید کی نہ صرف تقلید بلکہ پرستش میں مبتلا تھے۔ اور ایک لمحے کے لیے کبھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ سرسید اس سے کیوں مستثنیٰ کیے جائیں۔ سرسید سے انھیں علوم و معارف کا جو خزانہ ملا تھا اس پر نازاں تھے۔ توحید فی الذات، توحید فی الصفات، شرک فی صفت النبوۃ، شرک فی صفت القرآن وغیرہ سرسید کی اصطلاحیں اور ترکیبیں زبان پر چڑھی ہوئی تھیں اور مولانا کا خیال تھا کہ یہ نہایت قیمتی تعلیم ہے جو انھیں سرسید سے ملی ہے۔ مولانا کو سرسید کے مجتہدات کی تعلیم و اذعان میں اس درجہ استغراق اور اس کے نقص و ضعف سے مبرا ہونے پر اس درجہ کامل یقین تھا کہ اس کے شرک فی صفت القرآن ہونے کا شبہ کبھی دل میں نہ پیدا ہوتا تھا۔ سرسید سے مولانا کے کمال عقیدت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ شیخ غلام محمد مالک اخبار وکیل امرتسر سے تعلقات اس بنیاد پر قائم ہو گئے تھے کہ وہ بھی سرسید کے ایک غالی معتقد تھے اور ان کی جس بات نے مولانا کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور اپنا اہل الرائے ہونا ثابت کر دیا، اسے مولانا ہی کی زبانی سنیے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> "... ایک بات یہ بھی تھی کہ اتحاد مشرب میں، میں بھی سرسید کی تقلید میں مخمور اور وہ بھی اس وادی میں اور کسی سے کم نہ تھے۔ پہلی مرتبہ جب وہ ملے تو مجھ سے کہا کہ سچ یہ ہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو ان کا (سرسید کا) دماغ تو نبوت کا دماغ تھا۔ میں یہ بات سن کر بہت خوش ہوا۔ گویا یہ رائے دے کر انھوں نے اپنا اہل الرائے ہونا مجھ پر ثابت کر دیا۔"

سرسید سے عقیدت و ارادت کے دور میں مولانا نے سرسید کے اجتہادات، ان کی خدمات، ان کے علم کلام پر ایک کتاب بھی لکھنی شروع کی تھی اور اس کا ایک حصہ مکمل بھی کر لیا تھا۔ اس کے ناتمام اوراق، ۱۹۲۱ء تک اس عہد کی یادگار مولانا کے پاس موجود تھے۔ ایک رسالہ حقیقت معجزات کے موضوع پر سرسید کے مسلک اور افکار کے مطابق لکھا تھا اور بمبئی سے حکیم محمد حسن شاہجہانپوری نے شائع بھی کروا دیا تھا۔

ارادت کا یہ عالم ہو اور عقیدت نے پرستش کی صورت اختیار کر لی ہو تو تنقیص تو درکنار کوئی سنجیدہ اختلاف اور تنقید بھی کیونکر گوارا کی جا سکتی ہے۔ بقول مولانا "طبیعت میں سرسید کی عقیدت پرستش کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ کوئی آواز جس میں ایک شائبہ اختلاف یا تنقیص ہو طبیعت کو گوارا نہ تھی۔ سرسید مرحوم کے ساتھ ان کا حلقہ، یا اس وقت کی میری اصطلاح کے بموجب "نورتن" بھی اسی درجہ محترم تھا، جس قدر سرسید۔" اسی زمانے میں شیخ عبدالقادر نے "حیات جاوید" پر مخزن میں ایک نقد شائع کیا اور ایک ریویو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے لکھا تھا جو پہلے شاید علی گڑھ گزٹ میں اور پھر ایک رسالے کی شکل میں بھی چھپ گیا تھا۔ شیخ صاحب نے کتاب کی عبارت اور اس کے مطالب دونوں پر چند اعتراض کیے تھے اور مولانا شروانی مرحوم نے کتاب کی ترتیب کی تعریف کی تھی لیکن یہ لکھا تھا کہ سرسید کے مذہبی کاموں کی نسبت بے لاگ رائے نہیں دی گئی ہے۔ خود مولانا کے بیان کے مطابق اعتراضات بہت ہلکے اور دھیمے لہجے میں تھے اور اس کے مقابلے میں گویا کچھ نہ تھے جتنے ہونا چاہیے تھے۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ:-

> "اس وقت مجھ پر یہ دونوں ریویو بہت شاق گزرے اور ایسا محسوس ہوا کہ گویا ایک بہت بڑی جناب میں گستاخی کی گئی ہے"

چنانچہ جب مولانا نے لسان الصدق جاری کیا تو اس میں حیات جاوید پر ریویو کا ایک سلسلہ شروع کیا - اور اس میں مذکورہ دونوں تنقیدوں کا بڑے جوش و خروش سے جواب لکھا - لسان الصدق مولانا حالی مرحوم کے پاس بھی جاتا تھا انھوں نے یہ ریویو پسند کیا اور مولانا کی ہمت افزائی کی - حیات جاوید پر اعتراضات و جوابات کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں : -

> " اعتراضات جو اس وقت کیے گئے تھے وہ زیادہ تر دو قسم کے تھے - کتاب کی ادبی حیثیت پر اور مذہبی مباحث پر - ادبی حیثیت سے انگریزی الفاظ کی کثرتِ استعمال پر مخزن نے نکتہ چینی کی تھی اور کتابیہ کے بعض حصوں کی عبارت ادبی درجے سے گھٹی ہوئی بتلائی تھی - جس کی ایک ایسے مصنف سے توقع ہونی چاہیے تھی - مذہبی اعتراض یہ تھا کہ سرسید کے مذہبی اجتہادات کی مدح سرائی میں محض طرف دارانہ اور مقلدانہ جذبے سے کام کیا گیا ہے - حقِ نقد ادا نہیں کیا گیا - یہ دونوں اعتراض صحیح تھے - لیکن میں نے اپنے جوشِ عقیدت میں ان دونوں کا رد کیا اور چند مقامات، جہاں بعض شرعی تاویلات سے مصنف نے دبا ہوا سا اختلاف کیا ہے یا اختلاف سرسید و محسن الملک میں محسن الملک کی تائید کی ہے مثلاً بحث "تعین ذوالقرنین" ، استجابتِ دعا وغیرہ اور جنھیں قطعاً سرسید کے اصول و مقدمات اسامیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے بطور شواہد نقد کے پیش کیا ہے اور ثابت کرنا چاہا کہ مولانا حالی نے بے طرفانہ اور نقادانہ بحث کی ہے "

"حیاتِ جاوید" کے بارے میں اس وقت مولانا کی یہ رائے تھی حالانکہ بعد میں وہ خود بھی انہیں نکتہ چینیوں کی صف میں آشامل ہوئے جن کے رد میں اس وقت انھوں نے پورے جوش و خروش سے کام لیا تھا اور انھیں بھی کہنا پڑا کہ حالی نے سرسید کی محبت اور تقلید کے استغراق میں واقعات و مباحث دونوں میں جو مداحانہ طریقہ اختیار کیا، وہ بالکل کھلا ہوا اور حد درجہ معذرت سے متجاوز ہے - اس وقت سرسید کی تقلید اور ان کے مسلک کا استغراق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ عقیدہ بن گیا تھا کہ تمام فرائض اور واجبات شرعیہ کچھ مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی ہیں اور ان کی پابندی سے مقصود ان مصالح و حکم اور فوائد کا حصول ہے اور مذہب کے تشدد و تاکید کی حیثیت صرف عدالتی تنبیہ جیسی ہے - جس طرح ایک قانون کو قائم رکھنے کے لیے اور عامۃ الناس میں اس کا رعب داب قائم رکھنے کے لیے تاکید و تشدد کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح اہل مذہب کے تشدد اور تاکیدات ہیں - ورنہ فی نفسہ وہ کوئی شے نہیں - یہ تمام وسائل ہیں - مقصود بہر حال کچھ اور ہی ہے -

یہاں پر ہم مولانا کے فرمودات میں سے ایک اقتباس پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"جب نئی روشن خیالی کی ہوا لگی اور سرسید مرحوم کا رنگ چڑھا تو . . اب صوم و صلوٰۃ کی حقیقت ہم وہ نہیں سمجھتے تھے جو عام لوگ سمجھتے ہیں۔ ہمارا معیار اعمال و احکام اب فلسفیانہ و حکیمانہ تھا۔ تاہم عمل پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا، جس سے اعمال کی پابندی و مزاولت متاثر ہوتی۔ سرسید کا ایک مضمون اوقاف نماز پر بھی ہے۔ اس میں انھوں نے زور دیا ہے کہ نماز کے اصل اوقات تین ہی ہیں جو قرآن میں آتے ہیں۔ "قرآۃ الفجر"، دلوک الشمس اور غسق اللیل۔ انہی تینوں وقتوں میں آنحضرت صلعم پانچوں نمازیں پڑھتے تھے اور یہ بہتر ہے لیکن ضروری نہیں۔ قیام و حضر میں بھی بلا عذر اگر ظہرین و مغربین پڑھ لی جائیں یعنی تین وقت میں پانچ نمازیں پڑھی جائیں، تو مضائقہ نہیں۔ سفر و حضر کی بنا پر جمع بین الصلاتین کی رخصت تو پہلے ہی سمجھ میں آچکی تھی اور منع و فسخ توجیہ بالکل دل کو نہیں لگتی تھی۔ ترمذی والی روایت شاذ بھی معلوم ہوتی تھی لیکن یہ عام و مطلق حکم، بالکل اجتہاد تھا، مگر ہم سرسید کے اتباع کے جوش میں اس کے اتباع پر بھی مجبور تھے"

اتباع سے یہاں مولانا کا مقصود اتباع فکری ہے نہ کہ اتباع عملی۔ اسی لیے کہ اسی سلسلۂ بحث میں مولانا فرماتے ہیں:۔

"چنانچہ ایک شارح کی طرح میں نے بارہا اس پر تقریریں کی اور نئی نئی دلیلیں تراشیں، مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن کی عادت کے رسوخ کی وجہ سے خود عمل کبھی نہیں کیا۔ طبیعت اس طرف راغب ہی نہیں ہوتی تھی کہ ظہر و عصر ملا کر پڑھیں۔ مسجد میں جاتے، ظہر ظہر کے وقت، عصر عصر کے وقت پڑھتے تھے۔ سرسید کے مسلک میں آکر اب سنن و نوافل کی بھی وہ تاکید نہ رہی تھی بلکہ ان کے اصول کے بموجب تو بس فرائض کا پڑھ لینا کافی تھا۔ جہاں تک بحث مباحثے کا تعلق ہے ہم اس کے بھی پورے مؤید تھے۔ خوب خوب بحثیں کرتے تھے۔ اعتقاد بھی یہی تھا لیکن مجھے یاد نہیں کہ عملاً کبھی سنن و نوافل میں کمی کی ہو"

جہاں تک سرسید کی تعلیمی اور زبان و ادب کی خدمات کا تعلق ہے، مولانا آزاد ہمیشہ اس کے معترف رہے لیکن سرسید کے مذہبی افکار و عقائد میں انہماک اور ان کے علوم و معارف میں استغراق کچھ مدت تک رہا اور اس کے بعد خمار شروع ہوگیا۔ یہ حصہ بیان اپنے الفاظ میں پیش کرنے کی بجائے، مولانا ہی کے بیان کا ایک اقتباس پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"کچھ مدت تک یہ نشہ خوب زوروں پر رہا لیکن اس کے بعد ہی خمار شروع ہوگیا۔ اچانک وہ منزل نمودار ہوگئی جو منزل کے بعد قدرتی طور پر پیش آنے والی تھی۔ عقائد و کلام کے انہماک

مذہبی عقائد و ارکان کی بحث و نظر اور اختلافات مذاہب کے مطالعہ و تدبر کا نتیجہ یہ نکلا کہ طبیعت میں از سر نو ایک نئے اضطراب کی ابتدا ہوگئی گویا یہ درمیان کا سکون جو سرسید کی تقلید سے پیدا ہوگیا تھا، محض ایک فریب ذہن تھا اور اس کے نیچے دل کا کوئی اطمینان موجود نہ تھا۔"

"جوں ہی مسلک سرسید کی جدت و غرابت کا اثر دھیما پڑا اور جو کیفیت ایک نئے نئے جوش کی سی پیدا ہوگئی تھی، جوں ہی وہ طبعی سکون کی حالت میں آگئی۔ دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا اور اپنی صحیح حالت محسوس کرنے لگا۔ سرسید کے مسلک نے پوری طرح تمام پچھلی خوش اعتقادیاں اور تقلیدی عقائد بیخ و بن سے اکھاڑ دیئے تھے۔ اور ذہن کو وادی مذہب میں ہر طرح کی آزادی و جولانی کا خوگر بنا دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شکوک و کاوش نے مزید وسعت اختیار کی اور سرسید کی انتہائی بلند پروازیاں بھی وہاں ساتھ دینے سے درماندہ رہ گئیں۔"

"سرسید کی رہنمائی نے اس منزل تک پہنچا دیا تھا کہ ہم سمجھتے تھے کہ اہل مذاہب کے تمام دعاوی و عقائد اس رنگ اور شکل میں جو عام طور پر تسلیم کئے جاتے تھے، محض وہم و خیال ہیں اور اصلیت کچھ دوسری ہے۔ لیکن اب یہ منزل سامنے آئی کہ عقائد کے جتنے حصے کو سرسید بھی منوانا چاہتے ہیں، وہ بھی وہم و خیال کیوں نہ ہو، وجود باری، ذات و صفات، بقائے روح، وحی و الہام، نبوت، شرائع و ادیان کیوں نہ یہ سب بھی ناقابل تسلیم و اعتراف ہوں۔"

"سرسید کے مسلک نے ان تمام عقائد کی حقیقت اتنی باریک اور نازک کر دی تھی کہ طبیعت کے لیے اسے بھی نکال باہر کرنا کچھ گراں نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً قدیم خیالات کے مطابق وحی کی بابت جو تصور تھا، وہ اتنا وزنی اور مافوق عقل تھا کہ دماغ اعتقاد و اعتراف کے بعد پھر اس سے انکار کرنا سہل نہیں سمجھ سکتا تھا۔"

"لیکن اب روشن خیالی تو یہ کہتی تھی کہ یہ سب جہل و اوہام کی اختراع ہے۔ اصلیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ انبیاء کرام، جو بالفطرۃ نوع انسانی کے سب سے زیادہ ذکی، مدرک، صحیح الحواس و القوی اور اشرف و افضل افراد ہوتے ہیں، ان کا نفس مزکی ایسے حقائق کا ادراک کرتا ہے، جو عام انسان نہیں کرتے، یہی القا و الہام ہے اسی کو وحی کہتے ہیں اور اسی کو چاہیں تو اور زیادہ شاندار تعبیرات میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔"

"نبوت و وحی کی یہ حقیقت اتنی نازک اور اخف ہوگئی ہے کہ بجز خواہ مخواہ کی خوش اعتقادی کے اور کوئی چیز اسے قائم نہیں رکھ سکتی۔ کیا یہ چیز ایک دانشمند کو اس سے باز رکھ سکتی ہے کہ وہ

حقیقت نبوت کی ہی حد تک پہنچ کر پھر اس قریبی اور سامنے کی سرحد پر نہ پہنچنے کہ نبی زیادہ فطین و ذہین اور زیادہ فعنائل اخلاق رکھنے والوں کا نام ہے - اور دماغ کی زیادہ صحیح ترکیب، ادراک کے زیادہ بلند عمل، اور طبعیت ذہنیہ کی نہایت اعلیٰ تقویم و تعدیل کا نام ہے اور اس کے بعد نبوت جس قدر باقی رہ جاتی ہے، وہ معلوم ہے ۔"

" فی الحقیقت خواہ حکمائے اسلام ہوں مثلاً شیخ اور فارابی وغیرہ یا موجود زمانے کے متکلمین ہوں جیسے سرسید، اس بات میں وہ اسی سرحد پر ہیں لیکن پیرایۂ بیان ایسا اختیار کرتے ہیں، جو معاملے کو زیادہ پریشان اور زیادہ غیر عامۃ الوود بنا دیتا ہے - اسی طرح تمام عقائد و اصول کا حال ہے - اور روشن خیالی و مذہبی تقلعف اپنی واقعی کوئی درمیانی ہستی نہیں رکھتا - فکری وجود صرف دو ہی ہیں انکار یا اقرار، یہ تیسری راہ چاہتے ہیں اور وہ محال ہے ۔"

" میرے سامنے اب سوالات کا ایک لاانتنا ہی سلسلہ تھا، مگر جواب کے لیے کوئی صدا نہ تھی جو اصول، جو منقدمات، جو دلائل، جو شبہات، پرانے افکار و عقائد کے رد میں ہم استعمال کرتے ہیں، کیوں ان کا وار ان چیزوں پر کبھی نہ پڑے - جس کو مذہب کی اولیات قرار دے کر الگ رکھ دیا ہے اور اس طرح رکھ دیا ہے گویا چھونا منع ہے - اگر منع ہے تو قدیم عقائد نے کیا قصور کیا تھا ؟"

" اب اچانک میری زندگی منقلب ہو گئی - میرے اضطراب و التہاب کی کوئی حد نہ تھی ایک گتھی سامنے آتی تھی، اسے سلجھانے لگتا تھا لیکن سلجھنے کی جگہ دس گرہیں اور پڑ جاتی تھیں - پھر ہر گرہ کے کھولنے میں دس اور نئی گرہوں کا مقابلہ پیش آتا تھا - ہر جواب بجائے خود ایک نیا سوال تھا - اور ہر جستجو کے یقین سے ایک نئے شک کی ہلاکت پیدا ہوتی تھی ۔"

(۲)

سرسید سے مولانا کے تاثر کا یہ پہلا دور تھا جو میرے خیال میں ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۴-۵ء تک رہا - اس کے بعد ایک دوسری منزل نمودار ہوئی جسے مولانا نے انکار و الحاد سے تعبیر کیا ہے لیکن میں یہاں اس دور کے لیل و نہار کا تذکرہ نہیں کروں گا - بلکہ سرسید کے تعلق سے دوسرے دور کا تذکرہ کروں گا - یہ دوسرا دور اگرچہ ۱۹۰۷-۸ء سے شروع ہو چکا تھا لیکن نمایاں طور پر یہ تبدیلی ۱۹۱۲ء سے نظر آتی ہے جب کہ مولانا نے الہلال جاری کیا - الہلال کے زمانے میں نہ صرف یہ کہ سرسید سے تاثر و عقیدت نہ تھی بلکہ اس کی پالیسی سرسید کی سیاسی و مذہبی مسلک کے قطعاً خلاف تھی - خود مولانا کا بیان ہے کہ :-

" الہلال نکلا تو اس کے مباحث مذہبی و سیاسی، دونوں اس خیال سے بالکل مختلف تھے جو سرسید مرحوم کا تھا حتیٰ کہ سختی کے ساتھ ان پر ایرادو اعتراض کیا گیا ۔" (آزادی کہانی خود آزاد کی زبانی)

بہرحال اس دور میں سرسید سے مولانا نے اختلاف بھی کیا اور ایراد بھی لیکن اس اختلاف کی کچھ حدود تھیں۔ وہ صرف سیاسی اور مذہبی میدان تھے جن میں مولانا ان سے متفق نہ تھے۔ مولانا کے علاوہ خود سرسید کے مدرسہ فکر اور علی گڑھ کے کئی ہونہار فرزندوں نے سرسید کی نہ صرف سیاسی اور مذہبی پالیسی سے اختلاف کیا بلکہ تعلیمی پالیسی سے بھی اختلاف کیا اور سرسید کی متعین کردہ سیاسی و تعلیمی راہ کے خلاف مختلف تحریکات کی رہنمائی کی۔ لیکن اس بحث کا یہ کوئی موقع نہیں۔ میں یہاں سرسید کے متعلق مولانا مرحوم کے آخری دور کے خیالات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا فروری ۱۹۴۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے موقع پر مولانا نے اپنے خطبے میں سرسید کی علمی، ادبی، تعلیمی، معاشرتی خدمات کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ "میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اسے اس مصلح کی بارگاہ تعلیم و اصلاح میں خراج عقیدت سمجھنا چاہیئے وہ شخصیت اس خراج عقیدت کی سزاوار کیوں نہ ہو جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کے لیے تعلیم جدید کی طرح نو ڈالی۔" عوام کے ذہنی رجحانات پر سرسید کے "تہذیب الاخلاق" کے ہمہ گیر اثرات کا مولانا نے اعتراف کیا ہے اس میدان میں برصغیر پاک و ہند کا کوئی دوسرا رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مولانا فرماتے ہیں:-

"عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات "تہذیب الاخلاق" نے چھوڑے ہیں برصغیر کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے۔ ..... اس رسالے کے اجرا سے موجودہ اردو ادب کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو نے اس رسالے کی بدولت اتنا فروغ پایا کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا اس دور کا کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جو تہذیب الاخلاق کے حلقہ ادب سے متاثر نہ ہوا ہو۔ دور جدید کے تمام بلند معیار مصنفین نے اس خوان نعمت سے لقمے چنے اسی حلقے کے اثر و نفوذ سے نقد و نظر کی قدریں اور فکر و خیال کے لیے زاویے متعین ہوئے۔"

علی گڑھ کی حیثیت صرف ایک تعلیمی مرکز ہی کی نہ تھی بلکہ سرسید کی مختلف النوع سرگرمیوں کے مرکز کی وجہ سے اس کی حیثیت ایک ذہنی اور ثقافتی مرکز کی ہو گئی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں:-

"سرسید مرحوم نے علی گڑھ میں نہ صرف کالج کی بلکہ ایک ایسے ذہنی اور ثقافتی مرکز کی بنیاد ڈالی تھی جو وقت کی ترقی پذیر رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔ ان سرگرمیوں کا مرکز خود سرسید مرحوم کی شخصیت تھی۔ اس شخصیت نے اپنے گرد اور بھی بہت سے دماغ جمع کر لیے تھے۔ جنھوں نے ان کا ساتھ دیا۔"

مولانا کے اس خطبے کا موضوع چونکہ "سرسید کی تعلیمی خدمات" تھا اس لیے اسی پہلو پر مولانا نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے میں یہاں صرف ایک اقتباس پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا:-

"آج مغربی تعلیم ہماری قومی زندگی کا جزو بن چکی ہے ..... لیکن ایک صدی پیشتر برصغیر کے جن

مصلحین نے جدید تعلیم کا بیڑا اٹھایا تھا ۔ انھیں سخت ترین مراحل سے گزرنا پڑا تھا ۔ ایک طرف شدید مخالفتیں تھیں اور دوسری طرف وہ مہم تھی جسے سر کرنا کوئی آسان کام نہ تھا ۔ ہر قدم پر نت نئی مشکلات کا سامنا تھا ۔ آغاز کار میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان پر قابو پانے کے لیے بھی ایڑی چوٹی تک کا زور لگانا پڑ رہا تھا چنانچہ ان مصلحین نے ان تمام شدائد کا بڑی حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا جو کسی تحریک اصلاح کے علم برداروں کو ہمیشہ پیش آتے رہے ہیں ۔ عوام کے دل و دماغ پر صدہا سال کے تعصبات کے غلاف چڑھے ہوئے تھے ۔ مسلمہ عقائد اور قدامت پسندانہ جذبات کے حاملین نے جدید تعلیم پر ناک بھوں چڑھائی اور اس کی مخالفت پر تل گئے ۔ جدید تعلیم کے مخالفین نے سب سے بڑا حربہ جو استعمال کیا، وہ تھا مذہب! مذہب کے اصول عقل و خرد اور علم و دانش کے ضوابط کی نفی نہیں کرتے لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے مذہب کی تصویر کچھ ایسے ہی انداز میں پیش کی گئی ہے کہ ہم اسے عقلیت کے منافی سمجھتے ہیں ۔ علم برداران مذہب کا عام نعرہ یہی تھا کہ "عربی تعلیم مذہبی تعلیمات کی نقیض ہے ۔ لہذا وہ لوگ جنھیں مذہب سے لگاؤ ہے، وہ اس شجر ممنوعہ کے قریب تک نہ بھٹکیں اور اس قدیم تعلیم سے ان کا دامن مضبوطی کے ساتھ منسلک رہے جس پر قدماء نے تصدیق و توثیق کی مہریں ثبت کی ہیں"۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ایک طویل مدت تک اس سے دامن کش رہے لیکن آخر کار جدت نے قدامت پر فتح پائی ۔ عوام نے قدیم تعلیم کے پرانے چولے اتار پھینکے ۔ جہاں تک برصغیر کے مسلمانوں کا تعلق ہے یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس جد و جہد میں جس شخصیت نے کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے موسس کی شخصیت تھی ۔

تعلیمی جنگ کا پہلا محاذ علی گڑھ تھا لہذا اس مقام کو ترقی پذیر قوتوں کی فتح و نصرت کا مظہر کہا جا سکتا ہے .....

سرسید کی پر عظمت شخصیت کی چھاپ ذہنی سرگرمیوں کے تمام شعبوں پر پڑی ۔ مذہب، تعلیم، معاشرت، زبان، ادب اور صحافت ان کی اصلاحی اور تخلیقی صلاحیتوں کی کھلی شہادتیں ہیں ۔

سرسید کی عظمت اور ان کی خدمات کا یہ اعتراف مولانا ابوالکلام کی زبان سے ہے جو ان کے سیاسی اور مذہبی مسلک کے مخالف تھے ۔ لیکن اگر سرسید کا کوئی معتقد بھی ان کی شخصیت و خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہے تو اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے ۔ مولانا کا یہ قول اسی خطبے سے مقتبس ہے:

"میرا خیال پہلے بھی یہی تھا اور اب بھی یہی ہے کہ سرسید مرحوم کی شخصیت انیسویں صدی کی ایک عظیم ترین شخصیت تھی"

نیّر اقبال

لسانیات کی تاریخ پر ایک نظر

(زیر نظر مقالہ Ferdinand De Saussure. کی کتاب Course in General Linguistics کے تعارفی باب کا ترجمہ ہے۔)

وہ سائنس جس کا آغاز زبان کے واقعات سے ہوا ہے اپنے اصلی اور صحیح مقصود کو حاصل کرنے سے پہلے تین دوروں میں سے گزری ہے۔

سب سے پہلے ایک چیز کا جو قواعد کہلاتی تھی۔ مطالعہ کیا جاتا تھا۔ یہ علم منطق پر مبنی تھا اس کو یونانیوں نے شروع کیا تھا اور خاص طور پر فرانسیسیوں نے جاری رکھا تھا۔ یہ مطالعہ سائنسی انداز فکر سے عاری تھا اور بذات خود زبان سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس کا واحد مقصود صرف صحیح اور غلط شکلوں کو تمیز کرنے کے لیے قواعد منضبط کرنا تھا۔ یہ نحو نہ جاتی تنظیم تھی۔ حقیقی مشاہدے سے بہت دور تھی اور اس کا دائرہ محدود تھا۔

اس کے بعد زبان دانی Philology سامنے آئی۔ اس کا ایک اسکول اسکندریہ میں بہت پہلے سے تھا۔ لیکن یہ نام اس سائنسی تحریک کو دیا جاتا ہے جس کو فریڈرک اگسٹ ولف نے ۱۷۷۷ء میں شروع کیا تھا اور جو آج تک جاری ہے۔ اس تحریک کا واحد اور اصلی مقصود صرف زبان نہیں ہے۔ ابتدائی ماہرین زبان خاص طور سے کتابوں کے متن کی اصلاح تاویل اور تنقید کیا کرتے تھے۔ ان کے مطالعہ کا منہج ان کو ادبی تاریخ رواج اور اداروں وغیرہ میں دلچسپی لینے کی طرف مائل کرتا تھا۔ وہ لوگ تنقید کے طریقوں کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لسانی مسائل کی وضاحت وہ بے حد واضح مقصد کے تحت کرتے تھے۔ اور وہ مقصد مختلف زمانوں میں لکھی ہوئی کتابوں کے متن کا موازنہ ہر مصنف کی مخصوص زبان کا تعین یا کسی مبہم یا متروک الاستعمال زبان میں بنائے ہوئے نقوش کی تشریح اور حل تھا۔ بلاشبہ ان جستجوؤں نے تاریخی لسانیات کے لیے زمین ہموار کردی۔ رسچل کے ذریعہ کیے ہوئے Plautus کے مطالعات حقیقتاً لسانی ہیں۔ لیکن تنقید پھر بھی ایک لحاظ سے

بے حد ناقص ہے۔ وہ لکھی ہوئی زبان کے پیچھے بالکل غلامانہ انداز میں چلتی ہے اور زندہ زبان کو بالکل بھول جاتی ہے اس کے علاوہ وہ لاطینی اور یونانی زمانہ عتیق کے سوا بہت ہی کم چیزوں سے کوئی تعلق رکھتی ہے۔

تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جب عالموں کو پتہ چلا کہ زبانوں کا ایک دوسرے سے تقابل کیا جا سکتا ہے۔ یہ دریافت "تقابلی لسانیات" کی بنیاد بن گئی۔ ۱۸۱۶ء میں فرانز بوپ نے ایک تصنیف کے ذریعے سنسکرت کا جرمن، یونانی، لاطینی وغیرہ سے تقابل کیا۔ اس تصنیف کا نام "سنسکرت زبان میں گردانوں کے نظام کے بارے میں" تھا *Uber das conjugations system der Sanskrit sprache*

بوپ ان زبانوں کی یکسانیتوں کی نشان دہی کرنے والا اور اس بات کا تعین کرنے والا پہلا شخص نہیں تھا کہ یہ تمام زبانیں ایک خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ کام اس سے پہلے بھی کیا جا چکا تھا۔ خاص طور پر انگریز مستشرق ولیم جونز (متوفی ۱۷۹۴ء) کے ذریعہ۔ لیکن ولیم جونز کے کچھ منتشر بیانات یہ ثابت نہیں کرتے کہ تقابل کی اہمیت اور قدر کو عام طور پر ۱۸۱۶ء سے پہلے سمجھ لیا گیا تھا۔ چاہے بوپ کو اس دریافت کے سلسلے میں تفوق حاصل نہ ہو کہ سنسکرت یورپ اور ایشیا کی بعض زبانوں سے رشتہ رکھتی ہے، پھر بھی یہ اس نے ہی پہچانا تھا کہ رشتے دار زبانوں کا تقابل آزاد سائنس کا موضوع بن سکتا ہے۔ ایک زبان کے ذریعے دوسری زبان پر روشنی ڈالنا اور ایک زبان کی شکلوں کی مدد سے دوسری زبان کی شکلوں کی تشریح یہ وہ کام ہے جس کو اس سے پہلے کسی دوسرے نے نہیں کیا۔

آیا بوپ سنسکرت کی ماقبل دریافت کے بغیر اپنی سائنس کی تخلیق کر سکتا تھا یا کم سے کم اتنی جلدی کر سکتا تھا یہ مشکوک ہے۔ یونانی اور لاطینی کے علاوہ سنسکرت کو تیسری شہادت کے طور ہی استعمال کر کے بوپ اپنے مطالعے کے لیے عظیم تر اور مضبوط تر بنیاد حاصل کر سکا۔ خوش قسمتی سے سنسکرت تقابل کے عمل کو منور کرنے کے کام کے لیے نادر طور پر مناسب تھی۔

مثال کے طور پر لاطینی *genus (genus, generis, generes, genera, generum etc)* اور یونانی *(ginĕōn, génos, géneos, génei, génea)* گردان کسی بات کو ظاہر نہیں کرتیں لیکن جیسے سنسکرت کے مطابقہ سلسلہ *(ganasām, ganas, ganasas, ganasi, ganasu)* کو شامل کرتے ہیں تصویر بدل جاتی ہے۔ پہلی نگاہ یونانی اور لاطینی شکلوں کی یکسانیت کو ظاہر کر دیتی ہے۔ اگر آزمائشی طور پر ہم اس مفروضہ کو قبول کر لیں کہ *(ganas)* ابتدائی شکل کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور یہ قدم تشریح کو

آسان کر دیتا ہے ۔ تب ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ یونانی شکلوں میں جہاں s بھی دو مصوتوں کے درمیان واقع ہوگا وہ لازمی طور پر گر جائے گا اور انھیں حالات میں لاطینی s تبدیل ہو کر "آر" بن جائے گا ۔ ایسی صورت میں سنسکرت گردان قواعدی طور پر ابتدائی شکل کے تصور کے لیے نظیر مہیا کر دیتی ہے اور وہ ابتدائی شکل ایک اکائی ganas ثابت ہوتی ہے جو کہ بالکل معین اور مستقل ہے ۔ لاطینی اور یونانی صرف اپنے ابتدائی دور میں ہی اس طرح کی شکلیں رکھتی تھیں جیسی بعد کی سنسکرت میں موجود ہیں ۔ ہاں سنسکرت رہبری کرتی ہے ۔ کیوں کہ اس میں تمام ہند یورپی s محفوظ ہیں ۔ بے شک سنسکرت ابتدائی شکل سے اور دوسرے خال و خط محفوظ کرنے میں ناکام ہوئی ہے ۔ مثال کے طور پر اس نے مصوتی نظام کو بالکل منقلب کر دیا ہے ۔ لیکن عمومی طور سے بنیادی عناصر جو سنسکرت میں محفوظ ہیں ۔ تحقیق میں قابل لحاظ حد تک مددگار ثابت ہوتے ہیں اور یہ اتفاق ہی کی بات ہے کہ دوسری زبانوں کے مطالعے میں بہت سے نقطے واضح کرنے کے لیے ایسا ہو گیا ہے ۔

دوسرے ممتاز ماہرین لسان جلدی ہی بوپ کے سلسلے میں اضافے کرنے لگے جیکب گرم جرمانی مطالعہ جات کا بانی (اس کی (Deutsche Grammatik ۱۸۲۲ء سے ۱۸۳۷ء تک چھپتی رہی) ۔ پوٹ جس کے اشتقاقی مطالعے نے ماہرین لسان کو مواد کا ایک قابل لحاظ ذخیرہ فراہم کیا ۔ کوہن جس کی تصانیف لسانیات اور ساتھ ہی ساتھ تقابلی اساطیری علوم سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اڈلف عالم بینفے اور آفرے وغیرہ ۔

آخر میں اسکول کے آخری نمایندوں میں سکس ملر ۔ جی کرٹیس اور اگسٹ شلیشر خاص توجہ کے متقاضی ہیں ۔ مختلف طریقوں سے ان تینوں نے ہی اعلیٰ تقابلی مطالعہ جات کو بہت کچھ دیا ہے سکس ملر نے فراست آمیز مباحثوں (زبان کی سائنس کے اسباق ۱۸۶۱ء) کے ذریعے اُن علوم کو عام کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن اس کی ناکامی کی وجہ ایک حد تک دیانت داری کی کمی تھی ۔ کرٹس خاص طور پر اپنے Grundzüge der griechen Etymologie (۱۸۵۸ء) کی وجہ سے ایک ممتاز زبان دان سمجھا جاتا ہے ۔ وہ پہلا آدمی تھا جس نے تقابلی زبان دانی اور کلاسیکی زبان دانی کے دبستانوں میں صلح و صفائی کی کوشش کی ۔ ان میں موخرالذکر دبستان نئی سائنس کی ترقی کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا ۔ اور دونوں ایک دوسرے کی طرف سے بدگمان تھے ۔ شلیشر پہلا شخص تھا جس نے منتشر جستجو کے نتائج کو منضبط کرنے کی کوشش کی اس کی Compendium der vergleichenden Grammatik der indogermanischen Sprachen ۱۸۶۱ - ۱۸۶۲ کم و بیش بوپ کی قائم کی ہوئی سائنس کی تدوین ہے ۔ اس نے ایک طرف اپنی خدمتوں کا ایک طویل ریکارڈ قائم کیا ہے دوسری طرف آج بھی تقابلی دبستان کے اہم نقطوں کی کسی بھی دوسری تصنیف سے زیادہ یاد تازہ کرتی ہے اور یہ اسکول ہند یورپی لسانیات کا پہلا باب ہے ۔

لیکن تقابلی دبستان جو کہ صریحی طور پر ایک نئے اور ثمر بار میدان علم کے در کھولنے کے وصف کا حامل ہے۔ لسانیات کی سچی سائنس کو قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ اپنے مطالعے کے موضوع کے صحیح مزاج کو پہچان لینے سے قاصر رہا۔ ظاہر ہے اس پہلے قدم کے بغیر کوئی بھی سائنس اپنے طریقے کی نشوونما نہیں کر سکتی۔

تقابلی زبان دانوں کی پہلی غلطی ان کی تمام دوسری غلطیوں کی مبدا بن گئی اپنی جستجوؤں میں جو صرف ہند یورپی زبانوں کا احاطہ کرتی تھیں، انھوں نے اپنے تقابل کے مفہوم یا ان رشتوں کی اہمیت کے بارے میں جو انھوں نے دریافت کیے تھے اپنے آپ سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ ان کا طریقہ بلا استثنا تقابلی تھا۔ تاریخی نہیں تھا۔ بے شک تقابل کسی بھی تاریخی تعمیر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ لیکن خود مختتم نہیں ہو سکتا۔ اور نتیجہ خیزی اس وقت اور بھی مغالطہ آمیز ہو جاتی ہے۔ جب تقابلی ماہرین دو زبانوں کے نشوونما کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے طبیعات کا ماہر دو پودوں کی بالیدگی کو دیکھ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر شلیشر جو کہ ہمیشہ ہم کو قدیم ہند یورپی سے ابتدا کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس طرح ایک مصدقہ تاریخ داں معلوم ہوتا ہے یہ بات کہنے میں کہ یونانی "e" اور "o" صوتی نظام کے دو مرحلے (grade) ہیں۔ کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتا۔ اس کے یہ بات کہہ دینے کی وجہ یہی ہے۔ سنسکرت صوتی تبدیلیوں کا ایک ایسا نظام رکھتی ہے۔ جو مرحلوں کے تصور کی طرف اشارہ کرتا ہے شلیشر نے خیال کیا کہ ہر زبان کو ان مرحلوں سے الگ الگ اور ٹھیک ایک ہی طریقے سے گزرنا ہوتا ہے۔ جس طرح کہ ایک قسم کے پودے الگ الگ طور پر یکساں نشوونمائی منزلوں میں سے گزرا کرتے ہیں اور اسے ایک مفروضہ "e" یونانی "o" میں دیکھا۔ ایک مفروضہ "a" کا مرحلہ سنسکرت "a" میں دیکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک قدیم ہند یورپی تبدیلی نے علیحدہ علیحدہ یونانی اور سنسکرت میں انعکاس کیا تھا اور دونوں زبانوں میں جو قواعدی اثرات مرتب ہوئے تھے ان میں مسلسل برابری نہیں تھی۔

بلا استثنا تقابلی طریقے نے غلط تصورات کے ایک تبیل کی طرف رہنمائی کی کیونکہ یہ تصورات حقیقت پر مبنی نہیں تھے۔ اس لیے سادگی سے زبان کے واقعات کی عکاسی نہیں کر سکے۔ زبان ایک مخصوص دائرہ سمجھی گئی۔ ایک چوتھی فطری بادشاہت اس انداز فکر نے دلائل پیش کرنے کے ایسے طریقوں کی طرف رہنمائی کی جنھوں نے دوسری سائنسوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ آج کوئی شخص اس زمانے میں لکھی ہوئی ایک درجن سطریں بھی دلائل کی نامعقولیتوں پر اور ان اصطلاحوں پر جو ان نامعقولیتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے استعمال کی گئی تھیں۔ چونکے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔

لیکن methodology کے نقطہ نظر سے تقابلی زبان دانوں کی غلطیاں بالکل ہی بے قیمت نہیں ہیں۔ ایک طفل سائنس کی غلطیاں ان غلطیوں کی بڑی بڑی تصویریں پیش کرتی ہیں جو سائنسی تحقیق کی ابتدائی منزلوں میں سرزد ہوا کرتی ہیں اور اس وضاحت کے دوران میں مجھے ان میں سے اکثر کی طرف اشارہ کرنے کا موقع ملے گا۔

۱۸۷۰ء کے ادبیب قریب تک ماہرین لسان ان اصولوں کو دریافت نہیں کر سکے تھے۔ جو زبانوں کی زندگی کو معمول کرتے ہیں۔ اس کے بعد سے انھوں نے زبانوں کے درمیان یکسانیت کو پہچاننا شروع کیا۔ تقابل لسانی نمونہ کا صرف ایک پہلو ہے

اور واقعات کو مرتب کرنے کا صرف ایک ذریعہ یا طریقہ ہے۔

لسانیاتِ خاص جو تقابلی مطالعہ جات کو ان کی صحیح جگہ عطا کرتی ہے اپنی ابتدا کے لیے رومانی اور جرمانی زبانوں کی احسان مند ہے۔ رومانی مطالعات جو Diez نے شروع کیے لسانیات کو اس کے صحیح موضوع کے قریب لانے کا آلہ بنے۔ اس کی "رومانی زبانوں کی قواعد" کے تالیف ہونے کی تاریخ ۳۸ - ۱۸۳۶ء ہے

Grammatik der romanischen Sprachen

کیونکہ رومانس زبانوں کے عالموں کو وہ سہولتیں مہیا تھیں جن سے ہند یورپی زبانوں کے عالم بے بہرہ تھے۔ ان کی لاطینی تک جو کہ رومانی زبانوں کی اصل ہے سیدھی پہنچ اور تصانیف کی بہتات نے بھی مختلف بولیوں کے عہد بعہد ارتقا کو تفصیل سے سمجھنے میں مدد کی۔ ان دو حالات نے تفکر کے میدان کو تنگ کر دیا۔ اور تحقیقات کے لیے نادر طور سے پختہ حدود فراہم کر دیئے۔ جرمانی زبانوں کے عالموں کو بھی ایسے ہی حالات مہیا تھے۔ حالانکہ وہ "اصل" کا بلا واسطہ مطالعہ نہیں کر سکتے تھے پھر بھی بے شمار تصانیف نے ان کو ان زبانوں کی تاریخ کا پتہ لگانے کے قابل کر دیا جنھوں نے اصل جرمانی سے کئی صدیوں کی مدت میں ارتقا پایا تھا۔ ہند یورپی عالم حقیقت کے قریب جتنے آئے تھے جرمانی عالم اس سے کہیں زیادہ قریب آتے ہوئے مختلف نتیجوں پر پہنچے۔

اس سلسلے میں پہلی سرگرمی امریکی عالم وٹنی نے پیدا کی وہ "زبان کی نشو ونما اور زندگی (۱۸۷۵)" کا مصنف تھا۔ کچھ زمانے بعد ایک نیا دبستان جدید قواعد نویسوں کے ذریعے قائم کیا گیا۔ ان کے تمام رہنما جرمن تھے۔ مثلاً کے برگسم اور ایچ اشف۔ جرمانی زبانوں کے عالم ڈبلیو برونے۔ ای سیورس۔ ایچ پال اور اسپونی زبانوں کے عالم لیسکن وغیرہ۔ انھوں نے تقابلی مطالعے کے نتائج کو ان کے تاریخی پس منظر میں رکھنے اور اس طرح سے واقعات کو ان کے اپنے فطری سلسلے سے ملحق کرنے میں حصہ لیا تھا۔ ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ کیونکہ اب زبان ایسا organism نہیں سمجھی جاتی تھی جو آزادانہ طور سے ارتقا کرتی ہے بلکہ لسانی گروہوں کے اجتماعی ذہن کی پیداوار سمجھی جانے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ ان عالموں نے پہچان لیا کہ زبان دانی اور تقابلی زبان دانی کے تصورات غلطیوں سے مملو اور ناکافی تھے۔ پھر بھی جدید قواعد نویس باوجود ان تمام خدمتوں کے جو انھوں نے سر انجام دیں مکمل سلسلے کو واضح نہیں کر سکے اور عمومی لسانیات کے بنیادی مسائل اب بھی حل کے منتظر ہیں۔

اصطلاحات

نظام	*System*	قاعدہ	*Rule*
شکل	*Form*	اصول	*Principle*
مصوتہ	*Vowel*	آئین	*Constitution*
مصمتہ	*Consonant*	ترتیب	*Order*
مبدا	*Source*	ترکیب	*Construction*

Grade	مرحلہ	Philologist	زبان داں
Stage	منزل	Linguist	ماہر لسانیات
Degree	درجہ	Text	متن
Frame	حد بندی	Set	تبیل

سرشار کی ناول نگاری

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

رتن ناتھ سرشار اردو کے عظیم ناول نگار ہیں، ان کی حیات اور کارناموں پر گنتی کے چند مضامین لکھے گئے ہیں اور وہ بھی نہایت تشنہ۔ ڈاکٹر ادیب نے بڑی محنت سے اس کتاب میں سرشار کے حالات زندگی اور تصانیف پر روشنی ڈالی ہے۔ اس تحقیقی مقالے پر مصنف کو الہ آباد یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کی تھی۔

قیمت چھ روپے پچاس پیسے

قاموس الکتب

بابائے اردو

کتابوں سے متعلق یہ کتاب انجمن کا عظیم الشان علمی کارنامہ ہے جو کئی جلدوں میں مکمل ہوگی، پہلی جلد شائع ہو چکی ہے جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے، اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں جتنی بھی کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں انکی یہ مکمل فہرست ہے تقریباً بارہ ہزار کتابوں کے متعلق تفصیلی معلومات دی گئی ہیں جو ۲۰×۳۰/۸ کے چودہ سو صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ ۱۹۶ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔

قیمت ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ، کراچی

ڈاکٹر سید سلیمان حسین

لکھنؤ کا تاریخی، سماجی اور معاشرتی پس منظر

ہمارے موضوع کے اعتبار سے اودھ[1] کی تاریخ کا آغاز ۹ ستمبر ۱۷۲۳ء سے ہوتا ہے۔ جبکہ سعادت خاں کو بادشاہ دہلی نے اودھ میں رعایا کی سرکشی اور بدنظمی دور کرنے کے لئے صوبہ دار مقرر کرکے بھیجا تھا اور جنہوں نے اودھ میں اس سلطنت کی بنیاد ڈالی جو برصغیر ہند و پاکستان میں "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" قرار پائی۔

---

[1] لکھنؤ کی تاریخ کا مفصل بیان خارج از بحث ہے۔ صرف ابتدا کا مختصر سا حال درج کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ اور اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں اختلاف ہے، بعض مورخین اس کا اصل نام لکشمن وتی یا لکھنا وتی قرار دیتے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ پہلے نیم شارن تھا اور یہاں سُوت جی اپنے ساٹھ ہزار مریدوں اور عقیدت مندوں کو جمع کرکے گرو ٹرپان کا درس دیا کرتے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ رام چندر جی نے بن باس کی مدت پوری کی اور دوبارہ اجودھیا کے تخت پر متمکن ہوئے تو انہوں نے یہ علاقہ بطور جاگیر اپنے رفیق سفر اور بھائی لچھمن جی کو عطا کیا اور انہوں نے ہی اسے بسایا تھا۔ غرض یہ طے ہے کہ لکھنؤ پہلے اجودھیا کے زیر نگیں تھا۔ سورج ونشی خاندان کے زوال کے بعد اس پر راجا وکرمادت نے بھی حکومت کی تھی نویں اور دسویں صدی عیسوی میں منگول کے تہار قبائل کی حکومت کا بھی یہاں پتا چلتا ہے جب راجا جے چند نے اودھ میں قدم جمائے اس وقت یہاں کے بعض حصے بجار قبائل کے اثر میں آگئے تھے۔ انھی طاقتوں سے حضرت سالار مسعود غازی (۴۲۴ھ) نے مقابلہ کیا تھا۔ اسی زمانے میں مسلمان یہاں آکر آباد ہوئے حضرت شاہ مینا علیہ رحمۃ (۸۸۰ھ) کا خاندان بھی اسی کے بعد یہاں آیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اودھ میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوتا تھا شہنشاہ اکبر نے ۹۹۰ھ میں اپنی حکومت کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا تو اودھ کا علاقہ ایک مستقل صوبہ اور لکھنؤ اس کا دارالسلطنت قرار پایا۔ شیخ عبدالرحیم بجنوری صوبہ دار مقرر کئے گئے

قدیم زمانے میں آنے والوں میں حضرت شاہ پیر محمد رح بھی ہیں۔ جنہوں نے لچھمن ٹیلے پر اپنی سکونت اختیار کی تھی جو انہی کے نام سے آج بھی مشہور ہے، اورنگ زیب نے اس بلند ٹیلے پر ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی تھی جو ٹیلے والی مسجد کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سعادت خاں کا اصل نام میر محمد امین تھا وہ نیشاپور کے سید نادے تھے ۔ ترک وطن کر کے ۱۷۰۸-۹ء میں بسلسلۂ تلاش معاش ہندوستان آئے اور یہاں اپنے بھائی میر محمد باقر کے ساتھ کچھ مدت عظیم آباد (پٹنہ) میں رہ کر جولائی ۱۷۱۱ء میں گجرات چلے گئے اور وہاں نواب سربلند خاں صوبیدار کی مصاحبت میں رہے ۔ موصوف نے انہیں سترہ روپے ماہوار پر اپنے خیمے نصب کرنے پر میر منزل کا عہدہ سپرد کر دیا ۔ ایک دن نواب صاحب شکار کو گئے خیمہ ایک نشیبی مقام پر ایستادہ کیا گیا ۔ اتفاق سے اسی روز موسلا دھار بارش ہوئی اور نواب صاحب کے خیمے میں پانی چلا آیا ، انہوں نے ایک رتھ میں بیٹھ کر تمام شب جاگ کر کاٹی ۔ صبح کو میر محمد امین کو بلا کر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا ۔ " تمہارا دماغ تو ہفت ہزاریوں کا معلوم ہوتا ہے ۔ اپنے کام میں دل ہی نہیں لگاتے " میر صاحب کو یہ کلمات بہت ناگوار گزرے ۔ چنانچہ ملازمت سے استعفا دے دیا اور دلی چلے آئے ۔ یہاں آ کر انہوں نے شاہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکا لے لیا اور اپنے حسنِ انتظام کی بدولت منصب ہزاری پر فائز و ممتاز ہوئے ان دنوں دلی میں سادات بارہہ کا بڑا زور تھا جن سے رعیت تو رعیت بادشاہ سلامت تک ڈرتے تھے ۔

برہان الملک نے سب کو بزور شمشیر مطیع و خراج گزار بنایا اور اس صوبے میں وہ حکومت بنائی کہ کسی عہد میں یہ بات حاصل نہ ہوئی تھی [۱] انہی زمینداروں میں شیخ عبدالرحیم بجنوری کی اولاد تھی جو شیخ زادے کہلاتے تھے ۔ انہوں نے لکھنؤ میں ایک محل تیار کیا تھا جس کے دروازے پر ایک برہنہ شمشیر لٹکی رہتی تھی اور صوبے دار دہلی سے وارد ہوتا تھا وہ اس محل کے پھاٹک سے جھک کر نکلتا تھا ۔ اس طرح شیخ زادوں کی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کرتا تھا ۔ جس وقت برہان الملک لکھنؤ میں وارد ہوئے اس وقت ان متمرد شیخ زادوں سے سخت مقابلے کا اندیشہ تھا ۔ اس لئے انہوں نے اپنی حکمت عملی سے

(گزشتہ صفحے سے آگے)

پرانے زمانے میں لکھنؤ نے بڑی ترقی کی تھی یورپین سیاح " لیکٹ " نے اپنے ایک رسالے میں جو ۱۶۳۱ء میں لکھا گیا ۔ لکھنؤ کو ایک عظیم الشان بستی قرار دیا ہے ۔ عہدِ اکبری میں یہاں ایک فرانسیسی تاجر نے گھوڑوں کی تجارت میں بڑا منافع اٹھایا تھا اور چوک کے قریب عالی شان عمارتیں تعمیر کرائی تھیں جو بعد میں نذرِ سرکاری قرار پائیں اور جب ملا نظام الدین سہالوی مرحوم لکھنؤ میں تشریف لائے تو یہ علاقہ عطیہ شاہی کے طور پر انہیں دے دیا گیا جو اپنے گردو پیش کے تمام مکانات کے ساتھ " فرنگی محل " کہلاتے ہیں ۔

محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱-۶۱ھ) کے عہد میں اودھ کا صوبیدار چھبیلے رام تھا جب مرا تو اس کا بھتیجا گردھر ناگر صوبیدار ہوا ۔ اس کے بعد اودھ کی صوبے داری برہان الملک سعادت خاں کو تفویض ہوئی ، جنہوں نے یہاں کے سرکش شیخ زادوں ، زمینداروں ، اور راجاؤں کی ان افت اور شورہ پشتی کا خاتمہ کر کے ایک نئی سیاسی ، سماجی اور معاشرتی زندگی کا آغاز کیا ۔

[۱] تاریخ اودھ جلد اوّل صفحہ ۳۸

شیخ زادوں کی طاقت ختم کر دی اور لکھنؤ پر قبضہ جمالیا۔ یہاں کا انتظام کرنے کے بعد وہ اجودھیا گئے اور آبادی سے کچھ فاصلے پر دریائے گھاگھرا کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ چند روز بعد انہیں برسات میں جو تکلیف ہوئی تو تھوڑی دور ہٹ کر ایک مناسب مقام پر اپنے لئے چھپر بنوایا۔ پھر اس کے بعد گرد کچی دیوار کا ایک بہت وسیع مربع حصار کھنچوالیا جس کے چاروں کونوں پر قلعہ بندی کی شان سے چار کچے برج بنوا دیئے۔ یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا کہ اس کے اندر متعدد رسالے پلٹنیں، توپ خانے، اصطبل اور دیگر ضروری کارخانے آسانی سے رہ سکتے تھے[۱]۔ بیگمات کے قیام کے لئے بھی یہی کچے مکانات تھے، غرض کہ اس بنگلے میں جب برہان الملک کو اضلاع کے دورے اور سفرہائے حکمرانی سے فراغت ہوتی تو قیام کرتے۔ اسی مناسبت سے اس بستی کا نام بنگلا پڑ گیا جو بعد کو فیض آباد کے نام سے مشہور ہوا۔

برہان الملک نے اپنا سارا وقت صوبے کے انتظام اور استحکام میں صرف کیا۔ مگر شاہانہ زندگی گزارنے کے بجائے سپاہیانہ ٹھاٹ میں عمر بسر کی، یہ ان کے حسنِ انتظام ہی کا نتیجہ تھا کہ صوبۂ اودھ کی آمدنی جو ستر لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ پہلے ہی سال ایک کروڑ ستر لاکھ تک پہنچ گئی[۲] اور جس میں ہر سال مزید اضافے ہوتے رہے۔ موت کے وقت انہوں نے خزانے میں نو کروڑ روپیہ چھوڑا تھا[۳]۔ برہان الملک کے انتقال کے بعد ان کے داماد اور بھانجے مرزا محمد مقیم صفدر جنگ صوبیدار بنائے گئے۔ ان کے زمانے میں احمد خاں بنگش اور حافظ رحمت خاں نے اودھ کے کچھ حصوں پر قبضہ جمالیا اور پٹھانوں نے ملیح آباد میں اپنا تھانہ قائم کر لیا۔ اس لئے صفدر جنگ کو اودھ پر پوری توجہ صرف کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس زمانے میں سماجی اور تمدنی تبدیلیوں کی رفتار بھی سست رہی اور شعر و ادب کے میدان میں طوفانی لمحے نہیں آئے۔

صفدر جنگ کی موت کے بعد ان کے بیٹے جلال الدین محمد مرزا شجاع الدولہ ۵۲-۱۷۵۳ء/۱۱۶۷ھ میں مسند نشین وزارت ہوئے انھی کے زمانے میں اودھ میں تہذیبی مرکزیت اور سیاسی اہمیت کی بنیاد رکھی گئی۔ دلی کے مہاجرین شعرا کے قافلے آنا شروع ہو گئے اور فارغ البالی و خوش حالی کا دور دورہ شروع ہوا۔ صاحب تاریخ فرح بخش نے اس زمانے میں اودھ کے مشاغل اور زندگی کے پہلوؤں کا ذکر جس جوش و خروش کے ساتھ کیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ فیض آباد کو تمام ہندوستان کے مقابلے میں ایک مرکزیت حاصل ہو گئی تھی۔ شجاع الدولہ کی دولت و ثروت، داد و دہش، حکمتِ عملی اور احساس قوت نے کچھ مدت کے لئے زوالِ سلطنت اور نکبت و افلاس کا تصور مٹا دیا تھا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ سیاسی طور پر اودھ روز بروز کمزور ہوتا جا رہا تھا اور انگریز دن بدن اودھ میں اپنے پاؤں جماتے جا رہے تھے۔ اگرچہ ۱۷۶۵ء کے صلح نامے کی رو سے انہوں نے اودھ

---

[۱] گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۲۲

[۲] تاریخ اودھ صفحہ ۴۷

[۳] عماد السعادت صفحہ ۲۹

کے کچھ علاقے شجاع الدولہ کو واپس کر دیئے تو یہ محض ان کی مہربانی تھی۔ ورنہ بکسر کی جنگ نے چوبیس گھنٹے کے اندر اس بات کا فیصلہ کر دیا تھا کہ ہندوستان اب مسلمانوں کا نہیں انگریزوں کا ہے[1] پھر بھی شجاع الدولہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر علاقوں پر علاقے بڑھاتے چلے جا رہے تھے اور اپنی بلند ہمتی سے نہ کبھی خود کو کمپنی کا فرماں بردار سمجھتے تھے اور نہ بادشاہ دہلی کا۔ انگریزوں سے انہوں نے اگرچہ تخفیفِ فوج کا وعدہ کر کے صرف پینتیس ہزار سوار رکھنے کا اقرار کر لیا تھا مگر وہ برابر اپنی فوج بڑھاتے رہے۔ اس حوصلہ افزا عروج کے ساتھ دربار اور شہر میں بھی بڑی چہل پہل پیدا ہو گئی تھی۔ گلی گلی حسن اور علم و فن کا چرچا تھا۔ خوشحالی کی وجہ سے لوگوں کی زندگی میں اطمینان و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ فیض بخش اس زمانہ کے فیض آباد کے چشم دید حالات یوں بیان کرتا ہے۔

"اپنے گھر سے پہلی مرتبہ نکلا تو ممتاز نگر پہنچا یہ مقام شہر کے مغربی دروازے سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں دیکھا تو ایک بازار لگا ہوا تھا اور خرید و فروخت کی گرم بازاری تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے، مٹھائیاں، شربت، فالودہ، کباب، پراٹھے، نان خطائیاں نظر آتی تھیں۔ راہگیر خریدنے میں سبقت کرتے تھے اور ایک دوسرے پر کثرتِ انبوہ میں گرے پڑتے۔ یہ ہنگامہ اور رونق دیکھ کر خیال گزرا کہ میں شہر میں داخل ہو گیا ہوں اور خاص چوک میں ہوں۔ لیکن کسی نے مجھے بتایا کہ ابھی تو میں شہر پناہ کے دروازے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ آخر کار میں شہر میں پہنچا۔ ہر جگہ ناچنے اور گانے والے طائفے دیکھے۔ جنہیں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک فوجوں کے ڈھولوں اور باجوں کی آوازیں برابر چلی آتی تھیں۔ گھڑیالوں کی صداؤں سے کان بہرے ہوئے جاتے تھے۔ گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، خچر، شکاری کتے، بیل گاڑیاں اور توپ لے جانے والی گاڑیاں قطار اندر قطار چلی جاتی تھیں، لباس فاخرہ پہنے شرفائے دہلی کے اعزا اور مٹھے دارِ اعلیٰ' ہر شہر کے گانے بجانے والے قوال، بھانڈ اور طوائفیں گلی کوچوں میں نظر آتی تھیں۔ چھوٹے اور بڑے سب کی جیبیں زر و جواہر سے بھری تھیں کسی کے وہم و گمان میں بھی مفلسی اور فلاکت کا گزر نہ تھا۔ نواب وزیر شہر کی آبادی اور رونق کے ایسے خواہاں تھے کہ معلوم ہوتا کہ فیض آباد شاہجہان آباد کی ہمسری کا دعویٰ کرے گا"[2]

اودھ میں تعیش پسندی کا رجحان شجاع الدولہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ موصوف کا طبعی میلان مہ جبیں عورتوں اور رقص و سرود کی طرف تھا جس کی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والے طائفوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہو گئی کہ کوئی گلی کوچہ اس سے خالی نہ تھا اور نواب کے انعام و اکرام سے وہ اس قدر خوش حال اور دولت مند ہو گئی تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرے دار تھیں۔ جن کے ساتھ دو دو تین تین عالی شان خیمے رہا کرتے تھے اور نواب صاحب حسب اضلاع کا دورہ کرتے اور سفر میں ہوتے تو نوابی خیموں کے

---

[1] گزشتہ لکھنؤ از صفحہ ۳۶

[2] لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۲۱-۲۲

ساتھ ساتھ ان طوائفوں کے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھکڑوں پر لد لد کر روانہ ہوتے اور ان کے گرد دس دس بانکوں کا پہرہ رہتا۔ جب حکمراں کی یہ وضع تھی تو تمام امرا اور سرداروں نے بھی بے تکلف یہی وضع قطع اختیار کر لی اور سفر میں سب کے ساتھ رنڈیاں رہنے لگیں۔[1]

شجاع الدولہ نے بکسر کی شکست کے بعد یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اب دہلی کی مرکزی قوت ختم ہو چکی ہے اور انگریز نیا اقتدار بڑھا رہے ہیں۔ اس لئے دہلی پہ تکیہ کرنے کی بجائے اودھ کو مضبوط بنانا چاہیئے، چنانچہ انہوں نے تمام سیاسی قوتوں سے عارضی صلح کر لی اور اپنی تمام تر توجہ ریاست کو مضبوط بنانے میں لگا دی۔ پھر اپنی خوش انتظامی اور علم و کمال دوستی سے صاحبانِ ہنر کے رجحان کو اودھ کی طرف مبذول کرا دیا۔ جس کے نتیجے میں صدہا ارباب علم وفضل ڈھاکہ، بنگالہ، گجرات، مالوہ، حیدر آباد، شاہجہان آباد، لاہور، پشاور، کابل ملتان اور کشمیر سے کشاں کشاں فیض آباد میں داخل ہو رہے تھے۔ شاہی گھرانے سے اس وقت جن شعرا کا تعلق تھا۔ ان میں سودا، بوعلی ہاتف، مرزا فاخر مکین، اشرف علی خاں فغاں، میر ضاحک اور میر حسن خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا کے کلام کو دیکھئے تو آپ کو یہاں کی زندگی کا رجائی پہلو نمایاں نظر آئے گا۔ ان کے کلام سے سوسائٹی کی خوش طبعی اور شگفتگی کا سراغ ملتا ہے۔

ابھی اودھ کی مکمل ترقی نہ ہو پائی تھی کہ دفعتہً شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے مرنے کے بعد موصوف کے بڑے بیٹے نواب آصف الدولہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۵ء) میں تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے ایک سال بعد لکھنؤ کو دار الحکومت بنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیض آباد پر خزاں آنا شروع ہو گئی اور پھر لکھنؤ کا دورِ ترقی شروع ہوا۔

نواب آصف الدولہ اپنے والد کے مقابلے میں نہ تو سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے تھے اور نہ ان میں حکومت چلانے کی پوری صلاحیت تھی لہٰذا اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انگریز کمپنی نے اودھ کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی جس سے مجبور ہو کر نواب نے کروڑوں روپیا انگریزوں کی نذر کر دیا۔ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کا نواب موصوف کی والدہ اور دادی سے جبراً روپیا وصول کرنا ریاست کی کمزوری اور نواب کی بے بسی کا آئینہ دار ہے۔ اپنی انہی مجبوریوں اور احساس کمتری کی وجہ سے وہ جب تک زندہ رہے انتظام ملکی سے بے تعلق اور مذہبی معاملات وخیر و خیرات کے سلسلے میں مستعد رہے عمر کے آخری حصے میں حکیم شفائی سے لا علاج مرض پیدا کرنے کی تدبیریں پوچھتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ آخر کار مرض استسقا میں مبتلا ہو کر راہیٔ ملک عدم ہوئے۔[2]

نواب آصف الدولہ کو اپنے والد کا جمع کیا ہوا خزانہ ہاتھ لگا لہٰذا انہوں نے داد و دہش اور رعایا پروری کا وہ بازار گرم کیا کہ لکھنؤ میں مثل مشہور ہو گئی کہ "جس کو نہ دے مولا اُسے دے آصف الدولہ"[3] لوگ اٹھتے بیٹھتے عزت و محبت کے ساتھ ان کا نام لیتے تھے اور ذاتی عیوب فیاضی کے دامن میں چھپ کر نظروں سے غائب ہو گئے۔

---

[1] گزشتہ لکھنؤ ص ۱۰

[2] گل رعنا از مولوی عبدالحی مرحوم ص ۱۵۶

[3] خمخانہ جاوید از لالہ سری رام جلد اوّل ص ۸

آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست و عشرت طلب بنا دیا تھا اور کسی کو موجودہ راحت و آرام کے انجام پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی۔ اس عیش پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظاہری صورت میں ان دنوں لکھنؤ کے دربار میں ایسی شان پیدا ہو گئی جو کہیں اور کسی دربار میں نہ تھی۔ اور ایسا سامانِ عیش پیدا ہو گیا تھا جو کسی جگہ نظر نہ آتا تھا۔[1]

آصف الدولہ خود شعر کہتے تھے، میر سوز کے شاگرد تھے۔ انہوں نے شاعروں کی سرپرستی اور قدردانی خوب کی، موصوف کے دربار نیز دیگر روسا امراء سے جو شعراء وابستہ تھے ان میں میر سوز، میر تقی میر، میر حسن، مصحفی، انشا، جرات، مرزا جان طپش، جعفر علی حسرت، سعادت یار خاں رنگین وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس دور کے شعراء میں بھی رجائی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کی سب سے اچھی مثال میر تقی میر ہیں۔ ان کے کلام میں بھی ماحول کی وجہ سے شدتِ تاثر کے بجائے دھیما پن پیدا ہو گیا تھا اور ان کو احساسِ حسن میں محبوب کی دلربا یادائیں یاد نظر آنے لگی تھیں۔

اس عہد کا ایک اور کارنامہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ نواب آصف الدولہ نے مذہب تشیع کی اشاعت میں انتہائی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے نائب حسن رضا خاں کے مشورے سے اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے جمعہ و جماعت کا سلسلہ قائم کیا اور پہلی بار ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کو غفرانمآب مولانا سید دلدار علی مجتہد کے اقتدا میں نماز پڑھی گئی۔ بقول مولوی عبدالحی مرحوم

"وہ یہ پہلا دن ہے کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علیحدہ کر لئے، نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے ہاتھ میں زمام مذہب دے دی گئی"[2] جناب غفرانمآب مرحوم نے اپنے تمام شاگردوں کو ہندوستان میں پھیلا کر عقاید کی تبلیغ و جمعہ و جماعت کے قیام کے ساتھ بہت سے مذہبی مراسم قائم کئے تعزیہ داری کا طریقہ بھی عام مسلمانوں سے علیحدہ قائم کیا۔ تعزیوں کی شکلیں بدلیں۔ براق کی جگہ ذوالجناح 'ماہی مراتب کے عوض علم اور پنجے' بانک پٹے کا فن دکھانے کے بدلے نوحہ خوانی اور سینہ زنی کو رواج دیا۔ اور شیعوں کو ایک مخصوص تہذیب و تمدن کے ساتھ ایک مستقل قوم بنایا۔[3]

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد چھ ماہ کے لئے ان کے لے پالک بیٹے وزیر علی مسندِ وزارت پر متمکن ہوئے ان کی معزولی کے بعد ۲۴ شعبان ۱۲۱۲ھ کو شجاع الدولہ کے بیٹے نواب سعادت علی خاں تخت نشین ہوئے وہ اودھ کے تمام فرماں رواؤں سے زیادہ بیدار مغز مدبر سیاست اور اس کے ساتھ نہایت کفایت شعار جز رس فرمانروا تھے۔ ملک کا انتظام انہوں نے غیر معمولی ہوشیاری، خوبی اور شائستگی سے کیا اگر انہیں اپنے زمانے میں پورا اطمینان نصیب ہو جاتا تو یقین ہے کہ گزشتہ تمام بدنظمیوں اور خرابیوں کو اودھ سے دور کر کے مکمل اصلاح کر جاتے[4] انہوں نے مسند نشینی سے قبل ہی انگریزوں سے یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ کمپنی کو چھپن لاکھ کے عوض چہتر

---

[1] گزشتہ لکھنؤ ص ۴۷

[2] گل رعنا ص ۱۵۳ بار سوم

[3] لکھنؤ کی زبان از شمسی لکھنوی ص ۱۹-۱۸

[4] گزشتہ لکھنؤ ص ۳۷

لاکھ روپے سالانہ ماہوار قسطوں میں دیا کریں گے۔ اس معاہدے کی وجہ سے نواب نے حساب کی جانچ کی، ادنیٰ ادنیٰ رقموں پر نظر ڈالی۔ معافیوں اور جاگیروں کی سختی کے ساتھ چھان بین کی۔ دربار کے مصارف میں جہاں تک ہو سکا کمی کی اور سلطنت کی آمدنی بڑھائی، اس طرح تیرہ کروڑ روپیہ جمع کر لیا۔[1]

نواب موصوف کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے غازی الدین حیدر رجب ۱۲۲۹ھ میں تخت نشین ہوئے۔ ان میں نہ تو والد کی سی بیدار مغزی تھی اور نہ سیاسی سوجھ بوجھ، بلکہ کچھ نقص دماغی تھا، کثرت منشیات سے مست رہتے تھے۔ انہوں نے سعادت علی خاں کی گاڑھی کمائی کا روپیہ ارباب نشاط کے لئے وقف کر دیا، باپ کے بھرے پُرے خزانے کو لٹانے کا موقع مل گیا اور لکھنؤ کے گلی کوچوں میں مینا بازار لگ گیا ان کے عہد میں انگریزوں نے اپنا سیاسی شکنجہ اور مضبوط کر لیا تھا۔ اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ انگریز کمپنی نے نواب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ خود مختاری کا اعلان کر کے بادشاہ کا لقب اختیار کر لیں۔ غرض کہ غازی الدین حیدر نے اپنے نام کا سکہ جس پر یہ شعر کندہ تھا شاہ دہلی کی خدمت میں روانہ کیا۔

سکّہ زد بر سیم و زر از فضل ربّ ذوالمنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

چونکہ دلّی کی مرکزی طاقت احمد شاہ درانی اور مرہٹوں کی قوت کے آگے سپر ڈال چکی تھی۔ اس لئے غازی الدین حیدر کی اس سرکشی کا جواب نہ دے سکی۔ اکبر شاہ ثانی نے بس اتنا کیا کہ دلی سے ایک سکّہ بھیجا جس پر یہ شعر کندہ تھا۔

سکّہ زد در جہاں ز جور فلک
غازی الدین شہ حرام نمک[2]

بادشاہت کے اس اعلان کے بعد لکھنؤ والوں کا احساس تفوّق اور تیز ہو گیا اور انہوں نے ادبی خود مختاری کا بھی اعلان کر دیا۔ اگرچہ علم و فضل کی نمائش یہاں سعادت علی خاں کے زمانے سے شروع ہو چکی تھی، لیکن جدید اصول کی ترویج کا باقاعدہ غلغلہ اسی دور سے بلند ہوا۔ ناسخ نے اپنی زبان کو ٹکسالی زبان قرار دیا جس کے بعد ایک نئے دبستان شاعری کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے علاوہ اگر زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی نظر ڈالی جائے تو انقلاب و تجدید کی اس تحریک کے نقوش صاف طور پر نظر آئیں گے۔

غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد شاہ نصیر الدین حیدر ۲۸ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ کو تخت نشین ہوئے۔ یہ بادشاہ ہوتے ہی عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے رجب علی بیگ سرور نے اپنی مشہور تصنیف "فسانۂ عبرت" میں، ان کی عیش پسندی کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے۔ دس سال کی بے اعتدالیوں کے بعد ۲ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ کو ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ ان کے بوڑھے چچا

---

[1] مرقع اودھ ص ۳۴

[2] گنجِ شائیگاں جلد دوم ص ۲۵۴

محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ موصوف کی طبیعت ناچ گانے اور کھیل تماشے کی طرف مائل نہ تھی۔ وہ تخت پر بیٹھتے ہی انتظامِ سلطنت اور امورِ خیر کے سرانجام دینے میں مصروف ہو گئے، انہوں نے کفایت شعاری کے اصول جاری کئے اور انتظام کو سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کی اپنے مختصر سے دورِ حکومت میں انہوں نے شہر کو بڑا پر رونق اور خوبصورت بنا دیا۔ ان کے زمانے میں شہر کی آبادی میں بھی بڑا اضافہ ہوا انہوں نے بارہ لاکھ روپے سے ایک وقف قائم کیا اور غربا و مساکین کی پنشنوں اور وظائف کا سلسلہ جاری کیا۔ جس سے آج تک صدہا افراد مستفید ہو رہے ہیں۔

محمد علی شاہ پانچ برس حکومت کر کے رحلت کر گئے اور ان کی جگہ ان کے بیٹے امجد علی شاہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ کو تخت نشین ہوئے۔ وہ اپنے والد سے بھی زیادہ محتاط اور پابند شریعت تھے۔ شرر نے انہیں "نماز گزار شب زندہ دار" کہا ہے ان کے عہد میں علمائے مذہب کو بڑا عروج حاصل ہوا اور سلطنت کا کام زیادہ تر علما کے ہاتھ میں آگیا۔ دربار شعر و شباب کی رنگینیوں سے زیادہ مذہبی معاملات کی طرف متوجہ رہا اور ایک خشک اور پھیکی علمی فضا کا دور دورہ رہا جس کی بدولت مرثیہ خوب چمکا اور اس نے غزل پر تفوق حاصل کر لیا۔

۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ کو واجد علی شاہ تخت حکومت پر متمکن ہوئے۔ انہوں نے اس کمی کو پورا کیا۔ اول وہ نظامِ سلطنت کی درستی کی طرف متوجہ ہوئے، دربارِ فوج اور انتظامی امور کی سختی سے نگرانی کی۔ لیکن کمپنی اور اس کے بہی خواہوں کی مداخلت سے تنگ آکر تصنیف و تالیف، شعر و ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ سے دل بہلانے لگے۔

واجد علی شاہ کے عہد میں تہذیب کے ہر شعبے میں انتہائی ترقی ہوئی اور لکھنوی خصوصیات زیادہ واضح اور شاندار نظر آنے لگیں۔ یہاں کا کلچر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ابھر کر ایک حسین و جمیل پیکر میں تبدیل ہو گیا، لیکن ۱۸۵۷ء میں یکایک اس عظیم اور روشن تہذیبی دور کا خاتمہ ہو گیا اور ملک انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ جنہوں نے ہندوستانی تہذیب کی صدیوں پرانی کمائی کو ہڑپ کر لیا جو اب ہمیں کبھی بھی میسر نہ ہو سکے گی۔

شرر مرحوم نے شاہانِ اودھ کے لکھنؤ کو ہندوستان میں مشرقی تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ قرار دیا ہے۔ یہ بیان یقیناً بالکل درست ہے کیونکہ اس دور کے لکھنؤ میں عوام کو ہر طرح کا سکون و اطمینان میسر تھا۔ اس لئے ان کی زندگی بھی بڑی متنوع ہو کر رنگا رنگ دلچسپیوں میں گھر کر رہ گئی تھی اور تہذیب کی نفاست اور پاکیزگی نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کر کے نوک پلک سے درست کر دیا تھا جس کے بعد ہر طرف تکلف و شائستگی کا دور دورہ ہوا۔

اودھ کی کل آبادی عہد غازی الدین حیدر میں ایک کروڑ بارہ لاکھ تھی اور لکھنؤ کی آبادی ڈھائی لاکھ سے کچھ زیادہ جس میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا۔

آبادی کے دو خاص جز تھے، ہندو اور مسلمان جن میں بڑے گہرے اور برادرانہ مراسم تھے اور دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے شادی و غم میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ عوام کی اخلاقی حالت بہت اچھی تھی۔ لوگوں کے کردار بہت بلند تھے۔ چونکہ

دولت کی فراوانی تھی اس لئے عوام عیش پسند ہو گئے تھے، انہیں آرائش و نفاست، رکھ رکھاؤ کا شدید احساس تھا۔ تکلف اور تصنع فطرت کا جزو اعظم بن چکے تھے۔ وہ شرافت اور رواداری کا ایک بلند تصور رکھتے تھے حکومت شیعہ تھی اس لئے ایرانی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ عوام کے کردار کی تعمیر ائمہ معصومین کی سیرتوں کے آئینے میں ہوئی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ کا باشندہ اپنی مخصوص وضع قطع، لب و لہجہ، اندازِ گفتگو، ادب اور سلیقے، نشست و برخاست سے ہندوستان کے تمام دوسرے باشندوں کی نسبت بہت بلند و ممتاز ہو گیا تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑا اتحاد تھا اور وہ آپسی میل جول، محبت و اخوت کی وجہ سے ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ خصوصیت کے ساتھ یہاں کے مسلمانوں نے ہندو کلچر کے اثرات کو بہت قبول کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کی بہت سی رسمیں مسلم معاشرت کا جزو بن گئیں۔ مثلاً اسلام نے بیوہ کی شادی اور طلاق پر کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ مگر یہ ہندو تہذیب سے دلی لگاؤ کا ہی اثر تھا کہ مسلمانوں میں بھی بیوہ کی شادی اور طلاق کو بہت معیوب سمجھا جانے لگا، شادی بیاہ کی بہت سی رسمیں تو بالکل ہندوانہ ہیں بلکہ یہ اثرات تقسیم میراث اور سلام مسنون تک میں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ "گارڈن آف انڈیا" کا مصنف ارون لکھتا ہے۔

SPEAKING GENERALLY IT MAY BE SAID ALL OUDH

MUSALMAN'S ARE MORE OR LESS HINDUS.

شیعہ حکومت ہونے کی وجہ سے لکھنؤ میں شیعیت اور عزاداری کو فروغ حاصل ہوا۔ شیعہ عزاداری کو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر پورے خلوص و احترام کے ساتھ پورا کرتے تھے۔ بقول ناشؔ :

"شیعہ لوگ صرف امام باڑوں میں جانے یا مجالس عزا میں شریک ہونے ہی سے امام سید الشہدا کا سوگ نہیں مناتے بلکہ زمانۂ عزاداری میں اپنے نفس پر بھی جبر کرتے ہیں اور تکلیفیں سہتے ہیں۔ وہ بہت متبذل، معمولی کھری چارپائیوں پر یا صرف چٹائی بچھا کر زمین پر لیٹتے ہیں۔ موٹا جھوٹا کھاتے پیتے ہیں۔ کم سالن اور مزے دار پلاؤ پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ عورتیں اپنے زیور بڑھا ڈالتی ہیں اور بناؤ سنگار کی تمام چیزیں بالائے طاق رکھ دیتی ہیں"[1]

بول چال کی زبان اردو تھی۔ مگر سرکاری کام کاج فارسی میں ہوتا تھا۔ اس لئے لوگوں میں فارسی زبان و ادب کا بڑا چرچا پیدا ہو گیا تھا اور وہ اسی میں اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ تعلیم کی طرف حکومت اور عوام کی خاص توجہ تھی۔ پورے اودھ میں مدرسوں اور مکتبوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا جس میں بچے تعلیم پاتے تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم مدرسوں کے علاوہ مسجدوں اور خانقاہوں میں بھی ہوتی تھی۔ وہاں قرآن مجید کی تعلیم کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔ ہندوؤں کی تعلیم برہمنوں اور کائستھوں کے ذمے

---

[1] شباب لکھنؤ ص ۴۹

تھی۔ ان کے بھی بڑی تعداد میں اسکول تھے جس میں سنسکرت کے علاوہ اردو اور فارسی کی بھی پڑھائی ہوتی تھی۔ پنڈت اعلیٰ التعلیم کے لئے بنارس جاتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ان کی ہر طرح سے اعانت ہوتی تھی اور انہیں بڑی بڑی اراضیاں مفت دی گئی تھیں۔ اگرچہ ہندو عورتیں اور لڑکیاں تعلیم سے غافل تھیں۔ مگر مسلمان لڑکیاں باقاعدہ تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے اودھ کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے۔

"اگرچہ ہندوستان کے سارے صوبوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہاں علماء موجود ہیں۔ لیکن صوبۂ اودھ اور صوبۂ الہ آباد کو وہ خصوصیت حاصل ہے جو کسی اور صوبے کے حصے میں نہیں آئی ہے کیونکہ اودھ اور الہ آباد دونوں ہی صوبوں میں پانچ پانچ یا زیادہ سے زیادہ دس کوس کے فاصلے پر شرفیوں اور نجیبوں کی بستیاں آباد ہیں۔ ان کو بادشاہوں اور حاکموں سے وظیفے، زمین اور مددِ معاش ملتی ہے اور انہوں نے مدرسے، مسجدیں اور خانقاہیں بنائی ہیں اور یہاں کے مدرسوں نے ہر جگہ علم حاصل کرنے والوں پر علم کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ طالبانِ علم گروہ در گروہ آتے ہیں اور جہاں بھی حالات موافق ہوتے ہیں تحصیلِ علم میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ پھر بستی کے صاحبِ توفیق طالب علموں کی دستگیری کرتے ہیں اور اس جماعت کی خدمت کو سعادتِ عظمیٰ جانتے ہیں۔"[1]

لیکن علم و ادب کی سب سے بڑی درس گاہ لکھنؤ تھا۔ مولانا سید دلدار علی صاحب مرحوم مجتہد (غفرانمآب) کی تحریک سے حکومت نے شیعہ بچوں کی مذہبی تعلیم پر خصوصی توجہ صرف کی تھی۔ اور آصفی امام باڑے میں تعلیم کا انتظام کیا گیا جہاں وہ اور ان کے صاحبزادگان نے علم کے چراغ روشن کئے اور شیعوں کے بڑے بڑے علماء پیدا کئے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں ایک دوسرا سرکاری مدرسہ کھولا گیا جس کا ماہانہ خرچ دو ہزار چھ سو روپے تھا۔ یہ واجد علی شاہ کے عہد تک قائم رہا اور انگریزی عملداری قائم ہوتے ہی تمام اسٹاف کو پنشن دے کر اس مدرسے کو بند کر دیا گیا۔ حضرات اہل سنت کی مذہبی اور دینی تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ فرنگی محل میں قائم تھا جس کے بانی ملا نظام الدین سہالوی مرحوم (۱۷۴۸ء) تھے جن کے نام پر درس نظامی آج تک موجود ہے۔ اسی طریقۂ تعلیم کو شیعوں نے بھی اختیار کیا اور آج تک شیعوں کی جملہ دینی درس گاہوں میں یہی درسِ نظامی رائج ہے۔ ہندوؤں کی تعلیم کا ایک مدرسہ بنیادگنج میں قائم تھا[2]۔

---

[1] ماثر الکرام۔ دفتر اول۔ ص ۲۲۲

[2] شاہ نصیر الدین حیدر کو انگریزی سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ خود انگریزی پڑھتے تھے اور انہوں نے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کو بیس ہزار روپیہ اودھ میں انگریزی تعلیم کی ترویج کے لئے دیا تھا۔ ایشیاٹک جرنل، دسمبر ۱۸۲۹ء کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہ مذکور کے حکم سے لکھنؤ میں ایک کالج قائم کرنے کا منصوبہ بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ مسٹر سیڈن کا تقرر بحیثیت پرنسپل کے ہو بھی گیا تھا۔ لیکن بادشاہ کے اچانک انتقال کی وجہ سے اس کام کی تکمیل نہ ہو سکی۔

کرسچین مشنریوں نے یہاں دو اسکول قائم کئے تھے۔ ایک گرلس اسکول جسے حکومت کی طرف سے دو سو روپے ماہوار

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

سلاطین کی تعیش پسندی اور پست مذاقی کی بدولت لکھنؤ کی معاشرت میں طوائف اور بازاری اور ادنیٰ طبقہ کی عورتوں کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ ان میں سے بہت سی شاہوں کی منظورِ نظر ہو کر بیگمات اور محلات کے درجہ تک پہنچیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیروں کی وضع میں یہ داخل ہو گیا کہ اپنا شوق پورا کرنے یا اپنی شان دکھانے کے لئے کسی نہ کسی بازاری حسن فروش سے ضرور تعلق رکھتے تھے[۱] اور اسی لئے کہا جاتا تھا کہ جب تک انسان کو رنڈی کی صحبت نصیب نہ ہو آدمی نہیں بنتا۔ لکھنؤ میں طوائفوں کے مکان شرفا کے کلب تھے[۲]۔ ان ارباب نشاط کی محفلوں سے یہ ضرور ہوا کہ عوام میں نفاست پسندی و تکلف اور تصنع پیدا ہو گیا۔ وضع قطع طرز کلام وغیرہ میں بڑی حد تک نرمی آگئی۔

اس کے علاوہ ہر خاص و عام کی تفریح کا خاص مرکز میلے ٹھیلے اور مقدس مقامات بھی تھے۔ درگاہ حضرت عباس علمبردار مقبرۂ شاہ نصراللہ خلوتی (رگشوگھاٹ)، کالی جی کا مندر (سعادت گنج)، بھیروں جی کا مندر (پل جھاؤ لال)، میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے تھے ہر نوچندی کو حضرت شاہ مینا کے مزار پر محفل ہوتی تھی جس میں طبقے کے لوگوں کا مجمع ہوتا اور قوالی و رقص کی محفلوں میں عقیدت مند اپنے فن کا بہترین نمونہ پیش کرتے تھے۔ مفتی عظمت علی کاکوروی مرقع خسروی (سال اتمام ۱۲۸۶ھ) میں تحریر فرماتے ہیں "درگاہ شاہ حضرت میناولی زیارت گاہ ہر خاص و عام ہے۔ ہر نوچندی جمعرات کو وہاں جلسے ہوتے ہیں۔ رنڈیاں وغیرہ کل اہل کسب ابتدائی نمود میں حصول مراد اور شہرت کے معتقدانہ . . . . . . آتے ہیں۔ سب ہندو و شیعہ سنی بخلوص مانتے ہیں"[۳]

بوڑھے مصحفی (متوفی سنہ ۱۲۴۰ھ) درگاہوں، کربلاؤں سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرماتے ہوئے وہاں جانے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں[۴]

نوچندی آئی دھوم سے چل تو بھی مصحفی
جاتی ہیں کربلا کو حسینوں کی ڈولیاں

انشا فرماتے ہیں ؎

کچھ نہیں معلوم پوچھو کون سا میلہ ہے آج
جاتیاں ہیں جو کھچا کھچ ڈولیوں پر ڈولیاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کی امداد ملتی تھی اور دوسرا لا مارٹینز کالج جو سنہ ۱۸۵۰ء میں قائم ہوا تھا اور اب تک موجود ہے۔ اس اسکول میں انگریزی کے علاوہ اردو فارسی اور عربی کی تعلیم کا انتظام تھا۔ یہاں کے فارغ طلبہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی میں بڑی آسانی سے ملازمت مل جاتی تھی۔ جس میں ۷۳ انگریز، ۶۹ ہندو اور ۷۴ مسلمان تھے۔

(ملاحظہ ہو پولیٹیکل پروسیڈنگس بابت ستمبر سنہ ۱۸۵۰ء۔ ۸ اگست سنہ ۱۸۵۱ء)

[۱] و [۲] گزشتہ لکھنؤ ص ۳۱/۲۳۰

رند کہتے ہیں ؎

میلہ ہے چاند گنج میں سورج گہن کا آج
تم کس لئے نہ غیرتِ شمس و قمر گئے

مرزا رجب علی بیگ سرور فسانۂ عجائب (۱۲۴۰ھ) میں عیش باغ کے میلے کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"عیش باغ میں تماشے کا میلہ، ہر وقت چین کا جلسہ، موتی جھیل کا پانی چشمۂ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا، پیاسوں کا دل لہراتا۔ بارہ سنگا رکے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا، زنگار رنگ کی پوشاک آپس کی جھانک تاک۔"

ایک دوسرے مقام پر فرنگی محل کے میلے کا ذکر یوں کیا ہے۔

"وہاں سے بڑھا، کان میں آواز آئی میلے کے مارے بہار ہے، شوقین البیلے بہن لے چلا جا فرنگی محل کے میلے کو۔"

محمد رضا برق لعبد غدر ان میلوں، ٹھیلوں، سیر تماشے کو یاد کر کے فرماتے ہیں ؎

ستے کیوڑے سے چھڑکتے تھے ہماری سڑکیں
پلکوں سے جھاڑتی تھی بادِ بہاری سڑکیں
غیرتِ گلشن فردوس تھیں ساری سڑکیں
رہتی ہیں پیشِ نظر ہائے وہ پیاری سڑکیں

پٹری ہم چھوڑتے تھے گومتی پر بجاروں میں
جلسے رہتے تھے شب و روز پریزادوں میں
شہرے تھے اپنے فنِ عشق کے استادوں میں
لوگ کہتے تھے ہمیں زلف کے آزادوں میں

بے فرنگی محل ان روزوں میں آرام نہ تھا
رات دن سیر سپاٹے کے سوا کام نہ تھا

لکھنؤ کی معاشرت میں تفریح کے اور بھی کئی شعبے تھے مثلاً چوسر، شطرنج اور چلیبی، مگر سب سے زیادہ پتنگ بازی اور جانوروں کی لڑائی کا تماشا لکھنؤ والوں کو پسند تھا۔ یہاں پتنگ بازی کے شوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آصف الدولہ کی پتنگ میں پانچ روپے کی مقیش کی جھلجھلی ہوتی تھی جو لوٹ کر لاتا اسے پانچ روپے دے کر لے لی جاتی تھی[1] جانوروں میں یہاں شیر، چیتے، ہاتھی، گینڈے

---

[1] گذشتہ لکھنؤ ص ۱۱۱

مرغ، تیتر، کلدم اور کبوتر لڑائے جاتے تھے۔ لیکن عوام کا مرغوب ذوق کبوتر، مرغ اور بٹیر لڑانا تھا۔ میر نے اپنی مثنوی مرغ باز ان میں مرغوں کی پالیوں کا ذکر کیا ہے۔ انشاء نے اس فن کے تمام اصول مثنوی مرغ نامہ میں قلم بند کئے ہیں، نواب سعادت علی خاں ایسا بیدار مغز بھی مرغبازی کا بہت دلدادہ تھا[۱]

ان تمام واقعات سے لکھنؤ والوں کی بے فکری، حسن پرستی، فارغ البالی اور رومانی زندگی کا پتا چلتا ہے۔ جس میں عوام سے لے کر خواص تک سب ایک رنگ، ایک حال میں مست تھے اور وقت نے انہیں اس احساس سے بے گانہ کر دیا تھا کہ وہ زندگی کے زوال آمادہ دور سے گزر رہے ہیں۔ تاہم وقت کے تقاضوں اور ماحول کے نئے نئے رجحانات شعر و ادب پر کافی اثر انداز ہوئے جن کو سمجھے بغیر لکھنوی طرز کی تصنیفات کو نہیں پرکھا جاسکتا۔

موسیقی کے فن نے بھی یہاں بڑی ترقی کی۔ شجاع الدولہ کی قدر دانی سے سارے ہندوستان کے موسیقی داں اودھ میں جمع ہو گئے تھے۔ آصف الدولہ کے عہد میں موسیقی پر ایک لاجواب کتاب[۲] اصول النغمات الآصفیہ لکھی گئی۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں ایک بہت بڑا کامل فن حیدری خاں یہاں موجود تھا[۳]

رقص کے فن نے بھی لکھنؤ میں ترقی کی۔ یہاں کی طوائفیں سارے ہندوستان میں مشہور تھیں۔ روساء کے لئے ناچ دیکھنا ضبطِ اوقات میں شامل تھا۔ ارباب نشاط کے علاوہ ناچنے گانے والوں کا ایک گروہ اور پیدا ہو گیا تھا جو کشمیری بھانڈ کہلاتے تھے۔ یہ نقل کرنے میں استاد ہوتے تھے۔ عورتوں کی تفریح کے لئے ڈومنیاں ہوتی تھیں جو ناچ اور گانوں کے علاوہ بھانڈوں کی طرح نقل کرتی تھیں۔ ہر محل اور ڈیوڑھی پر ڈومنیوں کا طائفہ ضرور نوکر ہوتا تھا[۴]

اس کے علاوہ لکڑی، پٹہ، بانک، بنوٹ، کشتی، برچھا، تیر اندازی وغیرہ بہادری کے فنون تھے۔ جنہیں یہاں کے عوام ضرور سیکھتے تھے۔ ناشٹن نے یہاں کے قد آور اور مسلح نوجوانوں کی تعریف کی ہے وہ لکھتا ہے:

"لکھنؤ کے باشندے بالعموم اونچے بتے نظر آئیں گے۔ ان کے پاس ڈھال، تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہو گی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار کرتے ہیں وہ بھی تلوار ضرور باندھتے ہیں گو جیگر د حضرات جب سیر گشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک کیوں نہ پہنے ہوں مگر طمنچہ کی جوڑی اور ڈھال دونوں لگائے ہوں گے۔ بھینسے کی کھال سے منڈھی ہوئی ڈھال جس میں پیتل کے پھول لگے ہوتے ہیں اکثر بائیں جانب کاندھے پر پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے مہیب صورت راجپوت اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان ڈھال

---

[۱] گزشتہ لکھنؤ ص۱۱۱

[۲] دو آخری تاجدار اودھ از نقی احمد ص۱۱۲

[۳] گزشتہ لکھنؤ ص۳۲۲

سے لیس تنتنے ہوئے نظر آتے ہیں اور اہلِ لکھنؤ کی پندارِ خودی و خود پسندی اور جوشِ نبرد آزمائی کو بخوبی عیاں کرتے ہیں۔ باشندگانِ لکھنؤ میں اسلحہ کا مذاق بچپنے ہی سے پیدا کرایا جاتا ہے۔ نیز اور برچھے یہاں لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں۔ اور جس طرح انگریز دائیاں بالعموم بچوں کے ہاتھوں میں جھنجھنے دے دیتی ہیں اسی طرح یہاں چھوٹے چھوٹے طمنچے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو پکڑا دی جاتی ہیں[۱]۔ غرضیکہ اس طرح کے سپاہیانہ علوم کا شوق لکھنؤ میں واجد علی دور تک ملتا ہے۔

سلیمین نے اپنی رپورٹ میں جو ٹھگی کے استیصال پر لکھی گئی تھی اس میں اودھ کے عوام کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس میں سلیمن نے ٹھگوں کی بہادری کی بڑی تعریف کی ہے، ان حقائق کی روشنی میں لکھنوی شاعری پر نسائیت کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ صحیح نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ معترضین اپنے مطلب کے چند اشعار چن لیتے ہیں اور وہ ضخیم سرمایہ نظر انداز کر دیتے ہیں جو لکھنؤ کے مردانہ صفات و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، داستانیں، مرثیے اور مثنویوں میں ایسے اشعار کثیر تعداد میں ملتے ہیں جن میں بہادری کے تذکرے ہیں۔

لکھنؤ کی زندگی یکسر امن و امان سکون و اطمینان آرام و آسائش کی تھی، شجاع الدولہ کے عہد سے غدر تک یہاں کے عوام کو کبھی کسی طرح کی ہلاکت سے دو چار ہونا نہیں پڑا تھا اس لئے لکھنؤ اور اس کے اطراف و جوانب میں صنعتوں کو پروان چڑھنے اور ہنرمندوں کو بہت طویل عرصے تک اپنے کام میں مشغول رہنے اور آرام و سکون کے ساتھ زندگی گزارنے کا اچھا موقع ملا تھا۔ لہٰذا یہاں کے فنون روز افزوں ترقی کرتے رہے اور یہاں کی زندگی میں رعنائی اور رنگا رنگی پیدا ہوتی اور ابھرتی رہی۔ لارڈ ہسٹنگز نے اپنے ایک رسالے میں یہاں کے کاریگروں کی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

AT LUCKNOW ARE TO BE FOUND THE BEST ARTISANS AND
MECHANICS OF EVERY KIND MEN LITTLE INFERIOR IN SKILL
TO OUR BEST WORK MEN AT HOME (IN ENGLAND

لکھنؤ میں علمی فنون مثلاً خطاطی اور مصوری کو خصوصاً بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہاں خطاطی کے بہت سے ماہرین جمع ہو گئے تھے عہدِ آصفی میں حافظ نور اللہ اور ان کے بیٹے ابراہیم خطاطی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ یہ حضرات خربوزے کے بیج پر سورۂ فاتحہ و قل ہو اللہ اور چنے کی دال پر نادِ علی و پنجتن کے نام لکھتے تھے۔ امام باڑہ حسین آباد پر طغرے خوش نویسی کے مظہر ہیں[۲]۔

مصوری میں بھی یہاں کاملین جمع تھے جن میں لالہ ٹھاکر داس کا جواب نہ تھا۔ ان کے علاوہ شاہانِ اودھ نے اچھے اچھے پینٹرز کمپنی کی وساطت سے کلکتے سے بلوائے تھے جن میں مسٹر ہیوم، مسٹر مرائے، مسٹر زوفینی، مسٹر مونٹر وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

آرائشی اور کارآمد فنون میں بھی لکھنؤ اس زمانے میں ایک نمایاں مقام رکھتا تھا۔ لکھنؤ کی میناکاری کا ایک خوبصورت نمونہ

---

[۱] شبابِ لکھنؤ ص ۳

[۲] ہنروران اودھ ص ۱۸

کلکتے کے عجائب گھر میں موجود ہے[1] مٹی کے کھلونے بنانا، کپڑے پر جالی کاڑھنا، چکن اور زردوزی کا کام، ہاتھی دانت کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بنانے، تعزیے بنانے اور فرد و رضائی کی چھپائی وغیرہ میں لکھنؤ بہت مشہور تھا۔

اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی میں اودھ کی معاشی حالت کا ہمیں بہت کم علم ہے۔ اس کے برخلاف سماجی حالات سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ذیل میں معاشی حالت کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

شجاع الدولہ کے عہد میں ایک مزدور ایک روپے مہینے میں اپنا پیٹ پال سکتا تھا[2] سید محمد بلگرامی نے تبصرۃ الناظرین میں الہ آباد کے نرخ قلم بند کئے ہیں۔ جو ۱۷۶۴ء کے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ سال انتہائی گرانی کا ہے اور اس وقت گیہوں ایک من دس سیر، ارد ایک من دس سیر، سرخ چاول ایک من فی روپے کے حساب سے سفید چاول ایک روپیہ میں، ۳۰ سیر، گھی ۲ سیر، کودوں ۳ من، ۲ سیر سرخ شکر، ۳ سیر سفید شکر، روپے فی سیر کے حساب سے فروخت ہوتی ہے۔ روپیہ میں ۹۶ تولے ہوتے تھے"

سعادت علی خاں کے وقت میں تین سال تک گیہوں روپے کا تیس[؟] سیر فروخت ہوا تھا[3] نجابت حسین خاں جو ۲۳ محرم ۱۲۵۹ھ کو جہلم دیکھنے کی غرض سے عظیم آباد سے لکھنؤ آئے تھے۔ انہوں نے یہاں کی دلفریبیوں کا تذکرہ ایک روزنامچے کی صورت میں قلم بند کیا ہے جس کا نام سوانح لکھنؤ ہے۔ اس میں موصوف نے اجناس کے بازار کا بھاؤ اس طرح تحریر کیا ہے۔

گیہوں کا آٹا ۲۲ سیر فی روپیہ، باسمتی چاول ۱۵ سیر فی روپیہ، معمولی چاول ۲۰ سیر فی روپیہ، چنا ۴۰ سیر فی روپیہ، خصی کا گوشت ۲ سیر فی روپیہ، گھی روپے میں پونے دو سیر، دال ارھر تیس سیر فی روپیہ، دال مونگ بیس سیر فی روپیہ، بازار کا گھی جس میں کھنڈی کا روغن ملا ہوتا تھا۔ روپے میں دو سیر بکتا تھا۔ شہر میں عام طور سے اسی گھی کا رواج تھا۔ عوام الناس اور بعض خواص بھی یہی گھی استعمال کرتے تھے۔ ملائی فی سیر بارہ ٹکے کے حساب سے بکتی تھی۔ جلاون کی لکڑی روپے میں ساڑھے تین من ملتی تھی۔ لکھنؤ کا روپیہ گورکھپوری پیسے کے حساب سے بائیس گنڈے کا ہوتا تھا۔

دکانوں کے بارے میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ یہاں ہر جنس و قماش کی چیزیں موجود ہیں۔ لکھنؤ کے کاریگر موحدانہ طبیعت رکھتے ہیں ان کی صنعت گری دیکھ کر صناعان چین کی عقل بھی دنگ ہے۔ بازار میں اہل حرفہ، بزازوں، صرافوں، جوہریوں اور زردوزوں کی دکانیں ہیں۔ بزازوں کی دکانوں میں دیسی اور ولایتی کپڑے بھرے ہیں۔ یہاں ململ، جامدانی، ڈوریا، چارخانہ، کامدانی، انواع و اقسام کے پارچہ جات موجود ہیں۔ جالی لوٹ، کامدار، بین سکھ، کھمٹی اور سمٹی، انگریزی اور فرانسیسی۔ کپڑوں میں سوتی، ریشمی، چھینٹ، مشروع، دانہ دار، گلبدن اور ساٹن بھی ہیں۔ خاص لکھنؤ کے بنے ہوئے کپڑے بیلدار، گلکار، زرتار، زرنگار اور وزنی کمخواب بھی فروخت ہوتے ہیں[4]

---

[1] انگریزوں کے عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، از عبداللہ یوسف علی ص۹۰

[2] شجاع الدولہ از سری واستوا: ص۳۶۲ جلد دوم۔

[3] تاریخ اودھ، جلد چہارم ص۴۵

[4] لکھنؤ سوا سو برس پہلے۔ نیا دور مئی سنہ ۶۰ء ص۱۴

لیکن اتنی ارزانی، خوش حالی، بازاروں میں چہل پہل اور رونق کے باوجود یہیں کی قدیم باشندہ بھولا بھٹیاری کے خیال میں غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں شہر زیادہ رونق دار تھا اور اس زمانے میں یعنی عہد امجد علی شاہ میں بادشاہ کی دناءت و خست طبع کے باعث شہر میں ویرانی کا عالم ہے[1]

اس دور میں غریب بھی نہال تھے۔ اس لئے کہ امراء کے شعار میں یہ چیز داخل تھی کہ وہ فیاضی سے داد و دہش کریں جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں کی پرورش ہوتی تھی۔ ہر امیر کا دستر خوان بہت وسیع تھا اور یہ لوگ اکثر جاڑوں میں اپنے نوکر چاکر اور متوسلین کو جڑاول بانٹتے تھے محتاج اور غریب کو خیرات اور صدقہ دینا مذہبی فرض سے بھی بڑھ گیا تھا اور شانِ امارت میں یہ چیز داخل تھی کہ امراء اور روساء کی سواریوں کے نکلنے کے وقت محتاج مجمع کرتے تھے اور ان کو نچھاور کے طور پر خیرات بٹتی تھی جس میں حیثیت کے مطابق پیسے، روپے اور اشرفیاں تک ہوتی تھیں۔ محرم کے دس دن اس قدر خیرات ہوتی تھی کہ غریبوں کے گھروں میں کھانا نہیں پکتا تھا۔ اس کے علاوہ غریبوں کی لڑکیوں کی شادی کا خرچ برداشت کرنا اور جہیز دینا بڑا ثواب سمجھا جاتا تھا۔ کنوئیں کھدوانا، پل بنانا اور سرائے یا دھرم شالوں کی مرمت کرانا امراء اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ اس طرح بہت سی دولت امراء کی خود بخود غریبوں کے کام آتی تھی اور غرباء کی مفلسی رفع ہوتی تھی[2]

الغرض یہ ہے اس مشرقی تمدن کے آخری نمونے کی مختصر سی داستان جس کا مطالعہ کئے بغیر لکھنوی ادب کو نہیں پرکھا جا سکتا کیونکہ یہاں کے مخصوص ماحول اور پر تکلف طرزِ معاشرت نے جس آراستہ پیراستہ تہذیب و تمدن کی تعمیر کی اس کی بہت واضح نشانیاں یہاں کے تمام اصنافِ سخن میں ملتی ہیں۔ لکھنؤ کی ادبی تخلیقات نے اپنے عصری رجحانات کی ترجمانی جس خوبی سے کی اس کی مثال دوسری زبانوں کے ادب میں مشکل سے ملے گی۔

یہاں کے ادب میں ہر شخص کے ذوق و شوق کی تسکین کا مکمل سامان موجود ہے۔ اگر آپ کو شعر و ادب میں روحانیت اخلاق، تصوف، فلسفہ، واردات قلب، علوئے تخیل، جذبات اور زبان و بیان کی صفائی کے نمونے دیکھنا ہوں تو لکھنوی ادب کا بغور مطالعہ کیجئے۔ یہاں کے ادب میں گہرائی، گیرائی، قافیہ پیمائی، تمثیل نگاری، اصناف میں تنوع غرض کہ جملہ خوبیاں موجود ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ معترضین لکھنؤ کے شہ پاروں کا مکمل جائزہ لیئے بغیر، اور ان تمام عوامل کو نظر انداز کرتے ہوئے جن سے یہاں کے ادب کی تعمیر ہوئی، اپنے فیصلے صادر فرما دیتے ہیں۔

---

[1] لکھنؤ، سوا سو برس پہلے، نیا دور مئی ۱۹۷۰ء ص ۱۴

[2] آخری تاجدار اودھ از نقی احمد ص ۶ - ۱۰۰

گرد و پیش

تصویر کا ایک رُخ

آزاد وطن کا ایک باغیرت افسر

خبر آئی ہے کہ ہمارے محکمہ ڈاک و تار کے افسر نے کسی مراسلے کا جواب اس لئے نہیں دیا کہ وہ اردو میں لکھا ہوا تھا۔ افسر نے مطالبہ کیا کہ مراسلہ انگریزی زبان میں ہونا چاہیئے۔

ذہنیت کا فرق

رومانیہ کے ایک فن کار آج کل پاکستان آئے ہوئے ہیں اور پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں اپنے فن، اپنی روایات اور اپنی قومی خصوصیات اور صنعات کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

گو کہ پاکستانی اب خود کو ایک آزاد قوم سمجھتے ہیں، مگر اکثر آزاد غلام رومانیہ کے فنکاروں کی گوری صورتیں دیکھ کر انگریزی میں گل افشانیٔ گفتار دکھانے لگتے ہیں اور بیچارے رومانیہ کے فنکار حیرت سے انہیں دیکھ کر کندھے ہلا دیتے ہیں۔ اب بیچارے پاکستانیوں کو کون سمجھائے کہ ساری دنیا انگریزوں کو صاحب نہیں مانتی۔

صدر یا پریسیڈنٹ

ریڈیو پاکستان نے اپنی لسانی پالیسی کے تحت صدر کے لفظ کو اچھوت قرار دے کر "پریسیڈنٹ" کا "عام فہم" لفظ اختیار کر لیا تھا۔ مگر قوم کو بہت حیرانی ہوئی جب خبروں میں صدر جانسن اور پریسیڈنٹ ایوب کے لفظ بار بار نشر کئے گئے۔

اردو کے ٹیلی پرنٹر

۱۳ جنوری ۱۹۶۸ء کو اردو ٹیلی پرنٹر سروس کا آغاز ہوا، اس موقع پر ایک تقریب میں ملک بھر کے صحافی، وزارت اطلاعات و نشریات کے معتمد اور دوسرے معزز مہمان موجود تھے۔ اردو کے یہ ٹیلی پرنٹر ایسوسی ایٹیڈ پریس آف پاکستان نے حال ہی میں خریدے ہیں۔ معتمد وزارت اطلاعات و نشریات نے کہا کہ اس اقدام سے اردو صحافت کی رفتار ترقی بڑھ جائے گی۔ ۱۸ جنوری سے پہلی بار اردو ٹیلی پرنٹروں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ لاہور اور راولپنڈی میں اے پی پی کے دفاتر میں نصب شدہ اردو ٹیلی پرنٹروں

پر دونوں طرف سے خبریں بھیجی گئیں۔ اب اردو اخبارات کے دفاتر میں ٹیلی پرنٹر لگنے کا کام رہ گیا ہے۔

خوش آئند رویہ

پبلک سروس کمیشن کو سرکاری ملازمتوں کے اعلیٰ ترین ادارے کی حیثیت حاصل ہے اور اس کے لئے انگریزی کی چھاپ لازمی سمجھی جاتی تھی۔ اگر ایک امیدوار نے کمیشن کو آزمانے کے لئے اردو میں خط لکھ کر فارم اور ضروری معلومات طلب کیں اور امیدوار کو یہ جان کر مسرت ہوئی کہ مطلوبہ فارم اور معلومات بلا تاخیر بھیج دی گئیں۔ یہ رویہ ایک ایسے ادارے کے شایان شان ہے جو ایک آزاد قوم کا اعلیٰ ترین ادارہ ہے۔

ریڈیو پاکستان کی لسانی پالیسی

ڈاکٹر سید عبداللہ نے گزشتہ دنوں ریڈیو پاکستان کا ایک کنٹریکٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ "جب تک مجھے ریڈیو پاکستان سے کوئی اختلاف نہ تھا، میں اس کے پروگرام قبول کر لیا کرتا تھا مگر اب جب کہ ریڈیو کی لسانی پالیسی کی وجہ سے اختلاف رونما ہو گیا ہے تو مجھے اس سے تعاون کرنے میں قباحت محسوس ہوتی ہے"۔

عمرکوٹ کے باشندوں کا مطالبہ

عمرکوٹ کے عوام نے اعلیٰ حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ عمرکوٹ میں اردو پرائمری اسکول قائم کئے جائیں۔ مطالبے میں کہا گیا ہے کہ یہاں سینکڑوں ایسے خاندان موجود ہیں جن کی زبان اردو ہے مگر اردو کی پرائمری تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ سندھی پرائمری اسکولوں میں بھی اردو کے تربیت یافتہ اساتذہ مقرر کئے جائیں۔

ایک مطالبہ

ڈاکٹر سید عبداللہ اور اسمبلی کے ایک ممبر نے اپنے اپنے بیانات میں مطالبہ کیا ہے کہ ٹیلی مواصلات کے اس افسر کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے جس نے اردو کا مراسلہ قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ آئین کی رو سے یہ قومی زبان کی توہین اور محب وطن افراد کی دل آزاری ہے جس پر افسر متعلقہ سے جواب طلبی ہونی چاہئیے۔

عِلمی، ادَبی، تعلیمی اَور تہذیبی خبریں

غیر ملکی کتابوں کی اشاعت

صوبائی کابینہ نے ایک فیصلے کی رو سے بیرون ملک شائع ہونے والی کتابوں اور مضامین و مقالات کو صوبائی حکومت کی اجازت کے بغیر مغربی پاکستان میں شائع کرنے والے شخص کو دو سال قید بامشقت یا دو ہزار روپے جرمانے کی سزا کا مستوجب قرار دیا ہے۔ یہ دونوں سزائیں بیک وقت بھی دی جا سکتی ہیں۔ کابینہ نے یہ فیصلہ گورنر مغربی پاکستان کی صدارت میں کیا۔ ترجمان نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ فیصلہ ادب اور قانون کی کتابوں کا سرقہ روکنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اب اس قسم کی کتاب یا مضمون شائع کرنے والے کو صوبائی حکومت یا حکومت کی طرف سے افسر مجاز سے اجازت حاصل کرنی ہو گی۔

ماسکو میں پاکستانی فنون لطیفہ

پاکستان کے فنون لطیفہ اور مصوری کی نمائش ماسکو میں مشرقی فنون کے عجائب گھر میں ہو رہی ہے۔ یہ نمائش سوویت یونین اور پاکستان کے ثقافتی تعلقات اور بڑھتے ہوئے تعاون کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس نمائش کا افتتاح مشہور مستشرق پروفیسر گافگورسکی نے کیا ہے اور اس موقع پر روس میں پاکستانی سفیر جناب سلمان احمد علی نے شرکت کی۔

مغربی پاکستان اساتذہ کنونشن

کراچی میں ۸ دسمبر کو مغربی پاکستان کالج ٹیچرز کنونشن کے موقع پر جامعہ کراچی کے شیخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کہا کہ قوموں کی زندگی کے لئے کسی کسی مقصد کا وجود ضروری ہے، منزل کا تعین کئے بغیر ہم بھٹکتے رہیں گے۔ شیخ الجامعہ نے مغربی ملکوں کے تہذیبی انحطاط کا حوالہ دیکر کردار کی تعمیر پر زور دیا۔ اجلاس کی صدارت کمشنر کراچی سید دربار علی شاہ کر رہے تھے۔

یونیسکو کے ادبی انعامات

ڈھاکہ سے پاکستان کے قومی کتاب مرکز کے ایک پریس ریلیز میں ارجنوری کو بتایا گیا ہے کہ عام دلچسپی کے موضوعات، بالخصوص بچوں کے لوک گیتوں اور کہانیوں پر مبنی تخلیقات پر ۶۶-۱۹۶۵ء کا یونیسکو ادبی انعام فرخ احمد اور اشرف صدیقی کی کتابوں پر دیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے نام "پاکھر بھاشا" اور "کشور کیجر لوک کہانی" ہیں جن کو دو دو ہزار روپے دیئے گئے ہیں، یہ کتابیں بنگالی اکادمی نے شائع کی ہیں۔

ارضیات کا نصاب

پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس کے ایک کلب کے افتتاحی جلسے میں شعبۂ ارضیات کی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت صوبائی وزیر زراعت ملک خدا بخش کر رہے تھے اور جس میں شیخ الجامعہ حمید احمد خاں نے بھی شرکت کی۔ صدر شعبۂ ارضیات نے خطبۂ استقبالیہ میں ارضیات کے مضمون کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ اس کا گہرا تعلق معدنیات و حجریات، معدومیات اور طبقات الارض کی جثانی ساخت و پٹرولیم اور ارضی طبیعات سے ہے، انہوں نے بتایا کہ ارضیات کا نیا نصاب تیار کیا جا رہا ہے جو اردو میں ہوگا۔

بے مقصدیت، زبردست خطرہ

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کے سالنامے کی ایک تقریب میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جسٹس عطاء اللہ سجاد نے اپنی تقریر میں کہا کہ "اس دور میں آسان رزق کی خواہش اور بے مقصدیت ہمارے معاشرے کے لئے عظیم خطرہ ہیں، بے مقصدیت جب کسی فرد یا قوم پر غالب آجاتی ہے تو پھر وہ تمام اقدار او جھل ہو جاتی ہیں جن کے تحفظ کے لئے بڑے بڑے پیغمبروں اور مصلحین نے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔

انجمن مصنفین پاکستان کی سالگرہ

انجمن مصنفین پاکستان کے معتمد عمومی جمیل الدین عالی نے اعلان کیا ہے کہ انجمن کی نویں سالگرہ کی تقریب ۳۱ جنوری کو کراچی میں منعقد ہوگی، جناب جسٹس ایس اے رحمان اس تقریب میں مہمان خصوصی ہوں گے۔ انجمن مصنفین پاکستان کی نویں سالگرہ پر مشرقی

اور مغربی پاکستان کے ادیب شرکت کریں گے اور اس موقع پر انجمن کے تمام ادبی انعامات کے نتائج کا اعلان کیا جائیگا

قائداعظم پر انگریزی کتاب کا ترجمہ

قائداعظم پر جی۔ الانا کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ بہت جلد شائع کردیا جائے گا، کتاب کا ترجمہ مشہور شاعر جناب رئیس امروہوی نے کیا ہے کتاب طباعت کی منزلوں میں ہے ۔ خیال ہے کہ اس سال کے وسط تک منظر عام پر آجائے گی ۔

شاخ شاخ مہکے گی

ادارہ مصنفین پاکستان حیدرآباد کے ارکان کے ایک اجتماع میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ عنقریب وادی مہران کے نمائندہ افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا ایک مجموعہ "شاخ شاخ مہکے گی" شائع کیا جائے گا، جس کی تیاریاں شروع کردی گئی ہیں ۔ اس مجموعے کے مرتبین محسن بھوپالی اور قدیر غوثی صاحبان ہونگے

امریکی شاعر کی تقریب تعارف

مکتبہ میری لائبریری کی جانب سے مشہور عالم شاعر والٹ وہٹمین کی کتاب کا ترجمہ شائع کیا گیا- اور اسی سلسلے میں ایک تقریب جامعہ پنجاب کے وائس چانسلر کی صدارت میں منعقد ہوئی ۔ رچرڈ جیفرز کی اس کتاب کا ترجمہ پروفیسر سجاد حارث نے کیا ہے ۔ اس تقریب میں لاہور کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک نمائندہ اجتماع ہوا تھا۔ مقررین نے وہٹمین کی شاعری اور اس کے ترجموں کی خوبیوں پر روشنی ڈالی اور اس کتاب کا خیر مقدم کیا۔

ادیبوں کی کانگریس

ایران کے تمام ادیبوں کی ایک کانگریس مارچ میں منعقد ہو رہی ہے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کانگریس ہوگی جو ایران میں طلب کی گئی ہے ۔ اس اہم اور نمائندہ کانگریس کا افتتاح ایران کی ملکہ فرح پہلوی کریں گی ۔ کانگریس کی تیاریاں شروع کی جاچکی ہیں ۔

انجمن ترقی اردو لاڑکانا

انجمن ترقی اردو لاڑکانا کے زیراہتمام ایک مشاعرہ انجمن مذکور کی عمارت کے منصوبے کو عوام سے روشناس کرنے کے سلسلے میں منعقد ہوا، مشاعرے کی صدارت ڈپٹی کمشنر لاڑکانا نے کی میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ کاؤنسل نے سات ہزار روپے کا عطیہ دیا مرکزی انجمن ترقی اردو کے معتمد جمیل الدین عالی نے اس عطیے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ملک کے گوشے گوشے میں اردو کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ مشاعرے میں مقامی شعرا کے علاوہ کراچی سے جمیل عالی اور سراج الدین ظفر نے بھی شرکت کی۔

اس آئینہ خانے میں

روسی ادیب پاکستان میں

حال میں پاکستان میں روسی ادیب خیرسگالی کے جذبات لئے شہر شہر گئے ۔ اور انہوں نے تمام ادبی مراکز کی سیر کی ، وفد میں لینن امن انعام یافتہ میکائل لوکونین اور ماسکو میں افریشیائی مصنفوں کی رابطہ کمیٹی کے معتمد عمومی جناب لودی رومانیلو شامل ہیں

جناب میکائیل لوکونین نے کراچی میں اپنی مصروفیات کے بعد تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں انجمن ترقی اردو کے کام سے متاثر ہوا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے شاعر اور ادیب اپنی کاوشوں کے ذریعے ایک شاندار مستقبل کی تعمیر میں مصروف ہیں، انہوں نے بتایا کہ پاکستان کے نامور فن کاروں۔ اقبالؔ، فیضؔ، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب اور ایم اسلم جلیسؔ کی کتابوں کا ترجمہ روسی زبانوں میں کیا جا رہا ہے۔ جناب رومانیطو نے بتایا کہ جن کتابوں کا ترجمہ روسی زبانوں میں ہو چکا ہے وہ روس میں بہت مقبول ہیں، انہوں نے کہا کہ افریشیائی ادیبوں کی کتابوں کے ترجموں کی تعداد اشاعت روس میں دس کروڑ سے بھی زیادہ پہنچ چکی ہے۔ ملتان میں اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے جناب میکائیل لوکونین نے کہا کہ روس اور پاکستان کے ادیب ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں اور خاصی جذباتی وابستگی رکھتے ہیں

مجنوںؔ گورکھپوری کی آمد

برصغیر کے ممتاز نقاد اور صاحب نظر ادیب جناب مجنوںؔ گورکھپوری صاحب گزشتہ دنوں پاکستان آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا زیادہ وقت کراچی میں گزارا، اور ان کی آمد کی وجہ سے کراچی کے ادبی حلقوں میں خاصی گہما گہمی اور مصروفیت رہی، انہوں نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا، اگر ادب میں افادیت، مقصدیت، رومانیت یا اور کسی چیز کا پلّا ادبیت سے بھاری ہو جائے تو وہ ادب نہیں رہتا۔

ڈاکٹر شہید اللہ رو بصحت ہیں

ممتاز عالم اور منفرد ادیب ڈاکٹر شہید اللہ اب رو بصحت ہیں ڈاکٹر شہید اللہ کے آدھے جسم پر پچھلے دنوں فالج گر گیا تھا۔

گجراتی شعری مجموعہ اردو میں

کراچی میں گجراتی کے ممتاز شاعر جناب صابر تھاریانی کے مجموعۂ کلام کے منظوم اردو ترجمے کی اشاعت کے سلسلے میں اردو، گجراتی اور انگریزی کے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کا ایک اجتماع ہوا، جس میں جوشؔ ملیح آبادی نے صابر تھاریانی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کے تمام خوش فکر شاعروں کے مانند صابر کے نورانی سینے میں انفس و آفاق کا دل دھڑک رہا ہے۔ صابر تھاریانی کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ جو جوشؔ ملیح آبادی نے کیا ہے "صابر کے موتی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس ادبی تقریب کے منتظموں کی جانب سے صابر تھاریانی اور جوشؔ صاحب کو تحفے بھی پیش کئے گئے

یادوں کے چراغ

غالبؔ کی صد سالہ برسی

آئندہ سال فروری میں برصغیر کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر ساری دنیا میں خاص تقریبات منائی جا رہی ہیں۔ پاکستان میں یہ صد سالہ برسی غالبؔ کے شایانِ شان منانے کے لئے ابھی سے تیاری اور منصوبہ بندی شروع کر دی گئی ہے، لاہور

اور کراچی میں ان تقریبات کے لئے جامع منصوبے تیار کئے جا رہے ہیں۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان۔ روس، امریکہ اور برطانیہ میں بھی غالب کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ابھی سے دوڑ دھوپ شروع کر دی گئی ہے۔

یوم جوہر

ادیب، بے باک صحافی، شاعر اور آتش بیان مقرر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں لاہور اور کراچی میں متعدد جلسے ہوئے۔ لاہور میں دو جلسے ہوئے جن میں محمد علی جوہر کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا، صوبائی وزیر داخلہ نے کہا کہ مولانا تمام عمر انصاف کی سربلندی اور حق کی بالادستی کی خاطر جدوجہد کرتے رہے، نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ ان کی زندگی کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں

مولانا حالی کی یاد

بزم حالی کے زیر اہتمام جامعہ پنجاب سینیٹ ہال میں مولانا الطاف حسین حالی کی ۵۳ ویں برسی منائی گئی۔ اس موقع پر شیخ الجامعہ جناب حمید احمد خاں نے مولانا حالی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ حالی اس اعتبار سے ایک انقلابی شاعر تھے کہ انھوں نے زندگی سے بھرپور نظموں کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں میں جوش اور جذبہ پیدا کیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی سے جو مایوسی پیدا ہوئی تھی اسے ختم کر کے ان میں بیداری کی لہر پیدا کی۔ جلسے سے ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، خواجہ محمد شفیع دہلوی اور متعدد صاحب نظر افراد نے خطاب کیا

علامہ اقبال کو صدر کا خراج تحسین

صدر مملکت نے شاعر مشرق علامہ اقبال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انھیں بیسویں صدی کے شعرا میں ایک شہزادہ قرار دیا ہے انھوں نے دنیا کے عظیم شاعروں گوئٹے اور ملٹن کی مثال پیش کرتے ہوئے اقبال کو قوم کے کردار اور سیاسی شعور اور اخلاق پر اثر انداز ہونے والا شاعر کہا۔ صدر مملکت نے یہ خراج تحسین انجمن حمایت الاسلام کے صدر میاں امیر الدین کے نام ایک خط میں پیش کیا ہے۔

علی شیر نوائی کا یوم پیدائش

روس میں ازبکستان کے عظیم شاعر علی شیر نوائی کا ۵۲۵ واں یوم پیدائش منایا جا رہا ہے اسے خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ماسکو، تاشقند اور سمرقند میں تقریبیں منعقد ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ماسکو اور تاشقند میں خاص کمیشن مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ ۹ مئی ۱۹۶۸ء کو ہونے والی ان تقریبات میں علی شیر نوائی کی تخلیقات کا ایڈیشن دس جلدوں میں شائع ہو رہا ہے اور ان کے منتخب کلام کا مجموعہ الگ شائع ہو رہا ہے۔ ان کے نام پر تاشقند میں ایک عجائب گھر بھی قائم کیا جا رہا ہے جس میں ۲۰ ہال ہوں گے۔

غم میں ہم شریک

ڈاکٹر ظہیر الدین الجامعی کی رحلت

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مشہور ادیب، اقبالیات کے اہم ... اور عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ ثقافت اور مذہب کے

سابق ڈین ڈاکٹر ظہیر الدین کا ۷ر جنوری کو ۷۲ سال کی عمر میں کراچی میں انتقال ہوگیا، مرحوم اقبال اکادمی کے سرگرم رکن اور اقبال کے فلسفیانہ نظریات کے ایک اہم مفسّر تھے، ان کی ایک کتاب "اقبال کی کہانی کچھ اپنی زبانی" بہت مقبول ہوئی تھی۔ ادارہ "قومی زبان" اس سانحے پر دلی افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

ایک مشہور ناشر کا انتقال

دہلی سے عبد اللطیف اعظمی صاحب نے ایک نہایت افسوسناک اطلاع دی ہے کہ اردو کے مشہور اور مخلص ناشر جناب محمد یوسف جامعی کا اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ۳ دسمبر کی صبح کو دہلی میں ۷۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ جناب یوسف جامعی برصغیر کے مشہور ادبی پرچے شاہراہ اور مکتبہ شاہراہ کے مالک تھے۔

آئینۂ ہند

کی مرے قتل کے بعد

جن سنگھ کے صدر دین دیال دھیر نے کالی کٹ میں کہا ہے کہ اردو بھارت کا قیمتی ورثہ ہے اور اس کی حفاظت کی جانی چاہیے۔ انھوں نے اخباری نمائندوں سے کہا کہ اردو کو اس کا صحیح مقام دیا جانا چاہیے اور اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ جن سنگھ کے صدر نے کہا کہ ہم اس بات کے مخالف ہیں کہ اس زبان کے ساتھ کسی مذہب کا نام وابستہ کیا جائے۔

گوپال ریڈی کی تقریر

ایک استقبالیے میں تقریر کرتے ہوئے جناب گوپال ریڈی نے کہا کہ ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب، تمدن اور زبانوں میں اردو کا ایک خاص مقام ہے، اس کے استعارے، تشبیہیں دوسری زبانوں سے زیادہ حسین ہیں، اردو جیسے قیمتی سرمائے کے تحفظ کے لئے ہمیں ہر ممکن جد و جہد کرنی چاہیئے لیکن اسے سیاسی سوال بنا کر کسی الجھاوے میں نہیں ڈالنا چاہیئے، انھوں نے کہا کہ جو لوگ اردو کو کسی ایک طبقے اور کسی ایک مذہب سے وابستہ کرنے کی بات کہتے ہیں وہ غلط گو اور تنگ نظر ہیں۔

انگریزی کا جادو

ایک ایڈیٹر اور ممتاز وکیل جناب تیج بہادر سنہا نے ہندی کے حامیوں کو مشورہ دیا ہے کہ انگریزی سے چھٹکارا پانے کے لئے اردو کی مدد کی ضرورت ہے، انھوں نے کہا کہ اگر ہندی اردو سے خواہ مخواہ دشمنی مول لے لے تو اچھا نہیں ہوگا کیونکہ اکیلی ہندی انگریزی کا طلسم نہیں توڑ سکتی، انھوں نے اردو کو سراہتے ہوئے ہندی والوں سے کہا کہ اردو بھی ہماری اپنی زبان ہے، ہمیں چاہیئے کہ ہندی اور اردو دونوں کی مدد سے انگریزی کا طوق اتار پھینکنے کی جد و جہد کریں۔

کل پنجاب اردو کانفرنس

انجمن اردو پنجاب کے زیر اہتمام منعقدہ کل پنجاب اردو کانفرنس میں سردار گیان سنگھ کی سرکردگی میں ممبران اسمبلی اور دیگر معززین مالیر کوٹلہ نے مطالبہ کیا ہے کہ پنجاب میں

اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔ انھوں نے چار قراردادیں بھی منظور کیں، جن میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ لسانی فارمولے کی جگہ چار لسانی فارمولا نافذ کر کے اردو تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے۔ ریڈیو کے اردو پروگراموں میں صرف فلمی گانوں کی جگہ ادبی پروگرام شامل کئے جائیں۔ محکمۂ لسانیات میں اردو کا شعبہ بھی قائم کیا جائے اور اردو سے متعلق خصوصی تقریبات منعقد کرنے اور معیاری جریدے شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے، اردو اخبارات سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اردو کے خلاف خبریں شائع کرنے سے احتراز کریں۔

انگریزی کا وکالت نامہ مسترد

ضلع بلیا کے ایک مجسٹریٹ نے ایک وکالت نامہ اس بنا پر نامنظور کر دیا کہ وکیل نے اس پر انگریزی میں دستخط کئے تھے۔ مقدمے کی سماعت سے پہلے جب وکیل نے اپنا وکالت نامہ پیش کیا تو مجسٹریٹ نے کہا کہ اس پر ہندی میں دستخط ہونے چاہئیں۔ وکیل کے انکار پر مجسٹریٹ نے وکالت نامہ مسترد کر دیا۔

اردو کی مخالفت

جن سنگھ کے ایک لیڈر اٹل بہاری باجپئی نے بمبئی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میری پارٹی اردو کو بہار اور یو۔پی کی دوسری سرکاری زبان بنانے کی مخالفت جاری رکھے گی، اس سلسلے میں انھوں نے خود کو کانگریس کا صحیح مقلد کہا۔ جن سنگھ کی سیاست کس کروٹ بیٹھتی ہے اس کا تو پتا نہیں مگر اردو کے سلسلے میں جن سنگھ کے صدر اور لیڈر مذکور کے متضاد بیان محلِ نظر ہیں۔

اردو کا مطالبہ

ہندوستان کی سات ریاستوں اترپردیش، بہار، دہلی، ہریانا، پنجاب، ہماچل پردیش اور راجستھان میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے جنوری ۱۹۶۸ء میں چودہ زبانوں کے ادیبوں اور دانش وروں کا ایک کنونشن بمبئی میں منعقد ہوگا جو اردو کمیٹی کی طرف سے طلب کیا گیا ہے، کمیٹی نے اردو تحریک اور اس کے مطالبات کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ایک تجویز "اردو مطالبہ" مرتب کی ہے جو پارلیمنٹ کے اراکین اور چودہ زبانوں کے دانش وروں کے دستخطوں سے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو پیش کی جا رہی ہے۔

بنگلا ساہتیا سمیلن کا اردو اجلاس

حیدرآباد دکن کے جوبلی ہال میں نکھل بھارتیا بنگلا ساہتیا سمیلن کا اردو اجلاس پروفیسر حبیب الرحمان کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں بنگلا کے دانش وروں اور ادیبوں نے اردو کو خراجِ تحسین پیش کیا، شری جوتش چندر گھوش نے کہا "یہی وہ زبان ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ یہ زبان عوام کے ایک بڑے طبقے میں رائج ہے اور اس زبان نے ہمارے ادب کو متاثر کیا ہے، یہ ایک شیریں اور وسیع زبان ہے جس کے شیدائیوں میں راجا رام موہن رائے سے لے کر رابندرناتھ ٹیگور تک ہزاروں نام لئے جا سکتے ہیں۔" شری انل برن گنگو اپادھیائے نے بھی اردو کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

ماہنامہ کتاب کا مراٹھی نمبر

لکھنؤ سے جاری ہونے والے اردو ادبی ماہنامے "کتاب" نے جنوری ۱۹۶۸ء میں مراٹھی کہانی نمبر پیش کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ خصوصی نمبر مراٹھی

کے مشہور مترجم نور پرکار نے ترتیب دیا ہے۔ ماہنامہ "کتاب" اس سے پہلے بھی کئی اہم نمبر پیش کر چکا ہے، خصوصیت سے ہندی کہانی نمبر بہت مقبول ہوا تھا۔ مراٹھی کہانی نمبر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر

مشہور ادیب اور مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ عربی و اسلامی کے صدر جناب ڈاکٹر عبدالعلیم کو حکومت ہند نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا ہے۔ موجودہ وائس چانسلر علی یاور جنگ امریکہ میں ہندوستان کے سفیر مقرر کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم سے اردو دنیا بخوبی واقف ہے اور ان کی تقرری پر اظہار مسرت کیا جا رہا ہے۔

ادب اور جدید ذہن

مشہور اردو ادیب دیویندر اِسّر کی ایک کتاب مکتبہ شاہراہ دہلی نے "ادب اور جدید ذہن" کے نام سے شائع کی ہے جس میں موجودہ بحرانی تہذیب، ہمعصر ادبی رجحانات، انسان کے بدلتے ہوئے تصور، فرد اور تنظیم کی کشمکش وغیرہ کے موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

نریش کمار شاد کی ۴۰ ویں سالگرہ

دہلی۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۷ء کا دن راجدھانی کے ادبی حلقوں میں ناقابل فراموش تھا، اس روز اردو کے مقبول و ممتاز اور صاحب طرز شاعر نریش کمار شاد کی چالیسویں سالگرہ جشن شادؔ کے نام سے منائی گئی۔ اس موقع پر مجلس اشاعت ادب کی طرف سے ایک شاندار ادبی جشن کا انعقاد ہوا جس میں برگزیدہ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور ادب دوستوں نے شرکت فرمائی۔ سب سے پہلے لوین کمار جوشؔ نے جنھوں نے مودود صدیقی کے تعاون سے کتاب "شاد اور اس کی شاعری" مرتب کی ہے یہ اعلان کیا کہ آج شادؔ صاحب اگرچہ چالیس سال کے ہو گئے ہیں، لیکن فنی بلوغ کے اعتبار سے ان کی عمر اسی سال سے کم معلوم نہیں ہوتی، بہرحال آج کی یہ تقریب ان کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے جس کی صدارت حضرت عرش ملسیانی کریں گے اور رسم افتتاح کنور مہندر سنگھ بیدی ادا فرمائیں گے، چنانچہ اس تقریب کا افتتاح کنور صاحب نے نریش کمار شاد کو مجلس اشاعت ادب کی طرف سے ایک مطبوعہ کتاب "شاد اور اس کی شاعری" کی ایک جلد پیش کرتے ہوئے کیا، اس کے بعد کنور صاحب نے لالہ یودھراج کی طرف سے شادؔ صاحب کو پانچ سو روپے کا ایک ڈرافٹ دیتے ہوئے فرمایا کہ شاد صاحب کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ میرا ان کا غائبانہ تعارف اس وقت سے ہے جب وہ کانپور میں ماہنامہ "چندن" کی ادارت کرتے تھے۔ میں اسی وقت بھانپ گیا تھا کہ یہ نوعمر شاعر غیر معمولی ذہانت اور شدت احساس کا مالک ہے۔ اس کے کلام میں تڑپ ہے اور وہ واقعی دل سے محسوس کر کے شعر کہتا ہے، ذاتی طور پر ملاقات ہونے پر میرے تاثرات صحیح ثابت ہوئے۔ شادؔ صاحب کا شعور بالغ ہے اور جہاں دوسروں کی انتہا ہوتی ہے وہ وہاں سے اپنی ابتدا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے مجلس اشاعت ادب کا سرپرست ہونے کی حیثیت سے اپنی اشاعتی کارگزاری پر کچھ روشنی ڈالی اور نریش کمار شاد کو ان کی شخصیت اور شاعری سے متعلق کتاب چھپنے پر مبارکباد دی، بعد ازاں محترمہ ماجدہ شکور نے شادؔ کی شاعری میں تلخی اور اس کی سمت کا تعین" کے عنوان سے ایک فکر انگیز مقالہ پڑھا، پھر خوشتر گرامی نے اپنی تقریر میں کہا کہ جناب شادؔ نے

عزیز ہیں۔ میں نے ان کا بچپن، لڑکپن اور جوانی دیوانی سب کچھ دیکھا ہے۔ ان کے "شانِ نزول" اور "سرخ حاشیے" بیسویں صدی میں مستقل طور پر چھپتے رہتے ہیں۔ ان کے انٹرویو خاص طور پر مرحوم شخصیتوں کے ساتھ بڑے چونکا دینے والے ہوتے ہیں علامہ منور لکھنوی نے فرمایا کہ کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہر شخص اپنا عزیز ترین اور قریب ترین سمجھتا ہے، شاد صاحب بھی انھی میں سے ایک ہیں، تقسیم وطن کے بعد سے پنجاب کے بہت سے شعرا و ادبا دلی میں آ گئے ہیں، اس سے دلی کی ادبی فضا میں کافی رونق آ گئی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ پنجاب والے دلی والوں پر چھا گئے ہیں۔ مجھے شاد صاحب کی غزلوں اور نظموں کی بہ نسبت ان کے قطعات زیادہ پسند ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ شاد اور قطعہ لازم و ملزوم ہیں۔

جناب گوپی ناتھ امن نے شاد کی مماثلت، انگریزی کے مشہور شعرا شیلے اور کیٹس سے کی، انھوں نے فرمایا کہ ان تینوں نے کم عمری ہی میں ادب پر اَمِٹ چھاپ لگائی ہے۔ شاد صاحب کا ادبی ماحول بہت اچھا رہا۔ انھیں حضرت جوش ملسیانی سے تلمذ رہا ہے۔ مجھے ان کی غزلیں بڑی پسند ہیں، ان کا بھولا پن، دوست نوازی، سادگی اور دیگر ذاتی خوبیاں ان کے اچھے کردار کی ضامن ہیں۔

آخر میں صاحب صدر حضرت عرش ملسیانی نے شاد کی شعری صلاحیتوں اور ان کی انتھک ادبی کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں بھرپور خراج تحسین پیش کیا، اور اس کے بعد نریش کمار شاد نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور مجلس اشاعت ادب کے کارکنوں نے تمام حضرات کو "شاد اور اس کی شاعری" کی ایک ایک جلد پیش کی اور چائے کی پرتکلف دعوت کے بعد یہ جشن اختتام پذیر ہوا۔

سلسلۂ اصطلاحات۔

انجمن ترقی اُردو نے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کثیر تعداد میں وضع کی ہیں اور ہر علم کی اصطلاحات علیحدہ طور پر کتابی شکل میں شائع کی جا رہی ہیں۔ ان فرہنگوں میں انگریزی اصطلاحات کے مقابل اُردو مترادفات دیئے گئے ہیں۔ اصطلاحات کے جمع کرنے اور وضع کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ اصطلاحات وضع کرنے کے لئے متعلقہ علوم اور زبان کے ماہرین پر مشتمل کمیٹیاں بنائی گئیں جنہوں نے بابائے اُردو مرحوم کی نگرانی و رہنمائی میں اس کام کو مکمل کیا۔ اب تک حسب ذیل فرہنگیں شائع کی جا چکی ہیں۔

فرہنگ اصطلاحات بنکاری	قیمت :-	چار روپے پچاس پیسے
فرہنگ اصطلاحات فلکیات	قیمت :-	ایک روپیہ پچاس پیسے
فرہنگ اصطلاحات کیمیا	قیمت :-	تین روپے
فرہنگ اصطلاحات جغرافیہ	قیمت :-	ایک روپیہ

۔۔۔۔۔۔ انجمن ترقی اُردو ۔۔۔۔۔۔

بابائے اُردو روڈ، کراچی ۱